آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے باقاعدہ تصدیق اشاعت ABC CERTIFIED انسانی حقوق پر پاکستان کا پہلا جریدہ

ماہنامہ ہیومن رائٹس کراچی پوسٹ

ڈیٹا پرائیویسی اور سیکیورٹی خدشات

اشاعت کے 14 سال مکمل

کورونا وائرس کی دوسری لہر

کشمیر پر عالمی برادری کی مجرمانہ خاموشی

آبادی کا تناسب بدلنا خطرناک اقدام

خواتین کی ترقی لیکن استحصال کے ساتھ

انسانی حقوق پر پہلی نیوز ایجنسی، حکومت پاکستان سے منظور شدہ

HRNW

اردو اور انگریزی میں خبروں کی ترسیل

www.hrnww.com hrnww.com/urdu

HRNW

WWW.HRPOSTPK.COM

"آمدنی سے بڑھ کر جائیدادیں اور شاہانہ طرز زندگی"

افسر شاہی کے احتساب کے لئے نیا قانون، عمل درآمد کے بغیر بے معنی

جائیدادیں آمدن سے مطابقت نہ رکھنے والا حکومتی ادارے کا افسر کرپٹ شمار ہوگا خود بر د ثابت ہونے پر ریکوری، عہدہ سے تنزلی، جبری ریٹائر کیا جاسکتا ہے وفاقی حکومت نے سول سرونٹس ایفیشنسی اینڈ ڈسپلن رولز 2020 لاگو کر دیئے ہیں رولز 2 دسمبر کو وزیر اعظم نے نئے رولز کی منظوری دی تھی جس کے بعد 11 دسمبر کو اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کی جانب سے باضابطہ نوٹیفکیشن جاری کیا گیا

اس نئے قانون کی تفصیل کے مطابق جائیدادیں آمدن سے مطابقت نہ رکھنے والا افسر کرپٹ شمار ہوگا، سول سرونٹ پر خود بر د ثابت ہونے پر ریکوری، عہدہ سے تنزلی، جبری ریٹائر کیا جاسکتا ہے، سول سرونٹس رولز لاگو ہونگے، جواب کیلئے دس دن، ملزم جواب نہ دے تو اتھارٹی 30 دن کے اندر فیصلہ کرے گی۔ اسٹیبلشمنٹ ڈویژن کی جانب سے جاری کردہ 13 صفحات پر مشتمل ایس آر او میں مس کنڈکٹ کی تشریح کی گئی ہے۔ مس کنڈکٹ سے مراد یہ ہے کہ تقرری، پروموشن، ٹرانسفر، ریٹائرمنٹ یا سروس کے دیگر معاملات میں سیاسی طور پر اثر ورسوخ استعمال کرنا ہوگا۔ کرپشن کے بعد کسی بھی ایجنسی سے پلی بارگین کرنا بھی مس کنڈکٹ ہوگا۔ سول سرونٹ کے خلاف انضباطی کارروائی جن بنیادوں پر کی جاسکے گی ان کے مطابق وہ افسر کرپٹ شمار کیا جائے گا جس کی اپنی یا ان پر انحصار کرنے والے اثاثہ جات خانہ کی جائیدادیں ان کے ظاہری ذرائع آمدن سے مطابقت نہ رکھتی ہوں۔ یا ان کا طرز زندگی ذرائع آمدن سے مطابقت نہ رکھتا ہو۔ وہ تخریب کاری یا مشکوک سرگرمیوں میں ملوث ہوں۔ یا وہ سرکاری راز کسی غیر مجاز شخص کو بتانے کا مرتکب ہو۔ ایسی صورت میں ان کے خلاف انضباطی کارروائی ہوگی۔ ایس آر او میں سزا کی بھی تشریح کی گئی ہے۔ کم سزا (PenaltMinor) میں سرزنش (ensure)، سالانہ ترقی کی تنسیخی، متعین عرصہ کیلئے سالانہ ترقی کی انجماد جو زیادہ سے زیادہ تین سال کیلئے کی جاسکتی ہے۔ نچلے سکیل میں متعین عرصہ کیلئے تنزلی کی جاسکتی ہے۔ پروموشن بھی واپس لی جاسکتی ہے لیکن زیادہ سے زیادہ تین سال کیلئے۔ زیادہ سزا (PenaltyMajor) میں یہ شامل کیا گیا ہے کہ اگر سول سرونٹ پر خود بر د ثابت ہو جائے تو فائنل رولز کے تحت ان سے ریکوری کی جائے گی۔ نچلے سکیل میں تنزلی کی جاسکے گی۔ جبری ریٹائر کیا جاسکتا ہے۔ ملازمت سے فارغ کیا جاسکے گا۔ ملازمت سے برطرف کیا جا سکے گا۔ کسی سول سرونٹ کو سروس سے معطل کیا جاسکتا ہے یا جبری رخصت پر بھیجا جاسکتا ہے۔ دوران معطلی انہیں تنخواہ اور الاؤنس رول 53 کے تحت ملیں گے۔ انضباطی کارروائی کیلئے ضروری نہیں کہ انکوائری ہی کی جائے لیکن ایسی صورت میں الزام الیہ کو کارروائی کی بنیادوں سے آگاہ کیا جائے گا۔ جس کیس میں انکوائری موقوف کی جائے گی اس میں الزام علیہ (ملزم) تحریری طور پر آگاہ کیا جائے گا کہ ان پر یہ الزامات ہیں جس کی بنیاد پر انہیں یہ سزا دی جاسکتی ہے۔ انہیں شوکاز جاری کیا جائے گا۔ انہیں جواب کیلئے کم سے کم دس دن کا وقت دیا جائے گا۔ اگر ملزم جواب نہ دے تو اتھارٹی 30 دن کے اندر فیصلہ کرے گی سوائے جس میں صدر یا وزیر اعظم اتھارٹی ہوں۔ اگر سول سرونٹ کے خلاف انکوائری ہو تو انکوائری افسر کو متعلقہ ریکارڈ سات دن میں فراہم کیا جائے گا۔ اس میں صرف دس دن تک اتھارٹی توسیع کر سکتی ہے۔ انکوائری کیلئے انکوائری افسر ملزم سے سینئر ہونا چاہئے۔ انضباطی کارروائی کی بنیاد واضح ہونی چاہئے۔ ڈیپارٹمنٹ کا نمائندہ مقرر کیا جائے۔ انکوائری افسر ایک بھی ہوسکتا ہے اور انکوائری کمیٹی بھی بنائی جاسکتی ہے۔ کسی وجہ سے انکوائری افسر یا انکوائری کمیٹی کے کسی رکن کو تبدیل بھی کیا جاسکتا ہے۔ گواہوں کے بیانات ریکارڈ کئے جاسکتے ہیں اور دونوں پارٹیوں کے گواہوں پر جرح بھی کی جاسکتی ہے۔ اگر ملزم مقررہ عرصہ میں جواب نہیں دے گا تو انکوائری افسر یکطرفہ کارروائی کرنے کا مجاز ہے۔ انکوائری افسر یا انکوائری کمیٹی یومیہ سماعت کرے گی اور اگر کسی وجہ سے ملتوی کی جائے گی تو وجوہات تحریر کی جائیں گی۔ یہ التواء سات دن سے زیادہ نہیں دیا جاسکے گا۔ اگر انکوائری افسر یا کمیٹی یہ سمجھے کہ ملزم انکوائری کے عمل میں رخنہ ڈال رہا ہے تو اسے وارننگ دی جائے گی۔ اگر اس کے باوجود وہ باز نہ آئے تو کمیٹی کو اختیار ہے کہ جو طریقہ مناسب سمجھے اسے اختیار کرے تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں۔ ملتبی بنیادوں پر التواء بھی رجسٹرڈ مجاز میڈیکل افسر کی سفارش پر ہوگا۔ انکوائری افسر یا کمیٹی انکوائری کو 60 دن میں مکمل کرے گی۔ انکوائری افسر کو کسی کو بھی طلب کرنے اور حلف پر بیان لینے کا مجاز ہے۔ اسے دستاویز کے حصول کا اختیار ہے۔ دستاویز یا گواہوں کے معائنہ کیلئے کمیشن تشکیل دینے کا اختیار ہے۔ اگر کوئی افسر جس پر الزام ہو اور وہ لازمی تربیتی کورس جو اس نے کر چکا ہو تو اسے ٹریننگ کورس مکمل کرنے کی اجازت ہوگی۔ اسکالرشپ کی صورت میں بھی یہ سہولت حاصل ہوگی۔ اگر کوئی ملزم رخصت پر ہو تو اختیاری رخصت منسوخ کر کے واپس طلب کرے گی۔ ذاتی شنوائی کا موقع دیا جائیگا۔ اگر کوئی افسر ڈیپوٹیشن پر ہو تو الزام کی صورت میں متعلقہ محکمہ الزامات کی چارج شیٹ بنا کر اس محکمہ کو دے گا جس سے افسر کا تعلق ہو۔ اگر آل پاکستان کا سروس کسی صوبے میں تعینات ہو تو اسٹیبلشمنٹ ڈویژن چیف سیکرٹری سے کہے گا کہ فیکٹ فائنڈنگ انکوائری کی جائے اور اسے دو ماہ میں مکمل کیا جائے۔ اگر کسی چیف سیکرٹری کے خلاف انضباطی کارروائی ہو تو اسٹیبلشمنٹ ڈویژن وزیر اعظم کی منظوری سے یہ کارروائی کرے گا۔ سزا پانے والے ہر سول سرونٹ کو اپیل کا حق حاصل ہوگا۔ اگر صدر مملکت نے سزا دی ہو تو اس کے خلاف اپیل نہیں ہوگی البتہ ریویو آرڈر کی استدعا کی جاسکتی ہے۔

ملک میں؟ کرپشن کے خاتمے کے لئے یا کم از کم اس کا حجم کرنے کی غرض سے افسر شاہی کے لئے اس طرح کے قوانین لاگو کرنا ضروری تھا اس لئے تحریک انصاف حکومت کا یہ اقدام لائق تحسین ہے۔ اس ملک میں دراصل کرپشن کے اصل چوکیدار یہی افسر شاہی ہے جو چور کو کہتی ہے کہ چوری کرو اور گھر والوں کو کہتی ہے کہ آرام سے سو جاؤ میں چوکیداری کر رہا ہوں۔ اس قانون کے نافذ العمل ہونے کے بعد دیکھنا یہ ہے کہ اس پر عمل درآمد کس طرح ہوتا ہے کیونکہ عمل درآمد کرنے والی بھی تو افسر شاہی ہی ہے۔

اس قانون کی تناظر میں اگر دیکھیں تو سندھ کی بیوروکریسی یعنی افسر شاہی کرپشن میں سب سے زیادہ شتر بے مہار ہے، جہاں اہم ترین عہدوں پر 500 سے زائد ایسے افسران براجمان ہیں جو کہ نیب سے پلی بارگین کر کے اپنی جان چھڑا چکے ہیں اور اب جو کچھ نیب کو انہوں نے دیا تھا وہ سود سمیت وصول کرنے کے لئے اہم ترین مناصب پر کرپشن کی سرٹیفائیڈ پیپلز پارٹی کی حکومت کی آشیر واد سے قابض ہو چکے ہیں، اس لئے کہ یہ کرپشن سے کمانے کا ہنر جانتے ہیں اور پیپلز پارٹی کو ایسے ہی نابغہ روزگار سرکاری ملازمین کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے "قاقہ زدہ" معدوں کو کرپشن کے اربوں؟، کھربوں؟ روپوں سے بھر سکے۔ اس ضمن میں ایم کیو ایم کے سلمان مجاہد بلوچ نے ایڈووکیٹ نے بھی سندھ ہائی کورٹ میں ایک آئینی درخواست دائر کی ہوئی ہے، نیب زدہ افسران کے خلاف ایم پی اے ایم کیو ایم کنور نوید جمیل کی درخواست پر سماعت مورخہ ۱۲ دسمبر کو مکمل ہو چکی ہے۔ عدالت میں طرفین کے وکلاء نے اپنے دلائل مکمل کر لئے ہیں۔ کنور نوید کی طرف سے سابق ایم این اے سلمان مجاہد ایڈووکیٹ نے پیروی کی اور اپنی آئینی درخواست کے حق میں دلائل پیش کئے۔ عدالت عالیہ کے دو رکنی بنچ جسٹس ندیم اختر اور جسٹس عدنان کریم نے فیصلہ محفوظ کر لیا ہے جواب موسم سرما کے چھٹیوں؟ کے بعد سنایا جائے گا۔ درخواست کے مطابق حکومت سندھ کی جانب سے غیر قانونی طور پر 500 سے زائد نیب سے پلی بارگین کرنے والے افسران کو اہم عہدے دیئے گئے ہیں۔ اس درخواست میں؟ سلمان مجاہد ایڈووکیٹ نے عدالت سے استدعا کی ہے کہ پلی بارگینگ کرنے والے تمام افسران کو سپریم کورٹ کے 2016 کے فیصلہ کی روشنی میں فی الفور انکے عہدوں سے ہٹا کر نوکری سے برخواست کیا جائے۔ پانچ سو سے زائد افسران نیب قانون کے سیکشن ۵۲ کے تحت پلی بارگین اور والنٹری ریٹرن کا فائدہ لینے کے باوجود اعلیٰ عہدوں پر براجمان ہیں۔

ان دیکھنا یہ ہے کہ سندھ ہائی کورٹ اس بارے میں کیا فیصلہ دیتی ہے لیکن یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ سندھ حکومت کو بھی اندازہ ہو چکا ہے کہ ان کی کرپشن کے 500 پیادوں کی رخصتی کا وقت آن پہنچا ہے اس لئے اب کرپشن کے میدان میں نئے ہرکارے اتارنے کی صف بندی کی جارہی ہے۔ اس قانون کی نفاذ کے بعد وفاقی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ قومی احتساب ادارے کی بھی تشکیل نو کر کے اسے مزید طاقتور اور وسائل سے آراستہ کیا جائے تاکہ پورے میں اس قانون کی روح افسر شاہی جو پر اپرٹی زیادہ ترے نامی رکھتے ہیں ان کا سراغ لگا کر ان کے خلاف کارروائی کی جاسکے اور استقامہ کو مضبوط کرنے کے لئے سرکاری افسران کو بھی جدید خطوط پر تربیت دی جانی ضروری ہے۔

سندھ۔۔ ہر ادارہ کی سربراہ۔۔ مافیا

سندھ میں اس وقت مختلف چھوٹی بڑی کثیر طاقت اور ملی بھگت اور دیگر مافیا کام کر رہی ہیں جو اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے یا پھر اثر و رسوخ رکھنے والے افراد کے ذریعے ہر وہ کام کر رہے ہیں جس کے ذریعے ان کے بینک اکاؤنٹ اور دیگر آسائش زندگی و دیگر مراعات کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے ایک اچھا روشن مستقبل بنانے میں جائز یا ناجائز کام کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہر وہ انسان جو قانون کو بالائے طاق رکھ

کے چاہے وہ کام انسانی زندگی کے لیے مضر کیوں نہ ہو صرف اپنے مفادات کے لئے سرانجام دے رہا ہے۔ حقیقت یہ ہی ہے کہ کچھ لوگ اثر ورسوخ رکھنے والے لوگوں کو کیش کراتے ہیں اور تو کچھ پیسوں اور رقم کے ذریعے یا اثر لوگوں کی سرپرستی میں اپنے کاروبار کے ذریعے دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں اور کوئی اٹکا کچھ نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ دست شفقت بڑی چیز ہوتی ہے مگر آج تک وہ آہنی ہاتھ آخر کس کا ہوتا ہے یہ کسی کو کچھ نہیں پتہ اور اگر پتہ بھی چل جائے لفافہ پالیسی کے ذریعے ایک اور مافیا اس آہنی ہاتھ کے سامنے رکاوٹ بن جاتی ہے اور اس طرح ایک مکمل چین کسی بھی گلے کی زینت بن کر خوب چمکتی ہے، اور یہ چمک سب کی آنکھوں کو اندھا، زبان کو گونگا اور کانوں کو بہرا کرنے کے لئے کافی ہوتی ہے اور پھر یہی سے شروع ہوتا ہے عوام کا روایہ اور چھوڑ جاتا ہے نشان سوالیہ؟

کہنے کا مقصد یہ ہے گلے سے مافیا بننے کا سفر نہ جانے کیسے شروع ہوتا ہے۔ کراچی واٹر اینڈ سیوریج بورڈ والے جب شہر کراچی کے باسیوں کو پانی فراہم نہ کرسکیں اور عوام پیاس سے نڈھال ہو جائیں کیونکہ پانی انسان کی بنیادی ضروریات زندگی ہے مگر والو بورڈ ڈیم بھر جانے کے باوجود پانی عوام تک نہ پہنچا سکے تو پانی مافیا، ٹینکر مافیا کی پیدائیگری شروع ہو جاتی ہے اور پھر یا پانی عمر کے ساتھ بڑا ہو کر ایک طاقت ور مافیا بن گیا جسکے ہاتھوں شہر کراچی کے عوام یرغمال بنے ہوئے ہیں پھر اسی طرح گیس بجلی، ایل پی جی، اشیاء خورد ونوش، پھل فروٹ، گنگا، چھالیہ، ماوا، جیلانی، جس چیز کا مافیا، پیدا کرنا ہو اسکی قلت کردی جائے تو جیسے حالیہ دور میں بجلی، گیس، چینی و دیگر اشیائے ضروریات زندگی کی مصنوعی قلت پیدا کر کے خود ساختہ مہنگائی یا براہ راست مہنگائی کا اضافہ بوجھ عوام کے ناتواں کاندھوں پر ڈال دیا گیا اور چیز مہنگی ہونے کے باوجود بھی بازار سے غائب ہو جائے تو پھر ایک اور مافیا جنم لیتا ہے۔ جو لوگ منڈی میں گرین فوڈ زکی سپلائی کرتے ہیں اور وہ ذخیرہ اندوزی کرتے ہیں وہ ذخیرہ اندوز مافیا کہلاتے ہیں۔

آبکل جو زہر ہر خاص و عام میں مقبول ہے وہ ماوا، گنگا، جیم، ون ٹو ون، و دیگر منشیات کی چیزوں کو بھی غائب کر کے اسکو بھی اسقدر مہنگا کردیا مگر پھر بھی اس کے کھانے والے کیا خوب کھاتے ہیں اور اسی کے باعث یہ مافیا خود عوام یعنی ان سب منشیات کو کھانے چبانے والوں نے پاور فل بنادیا۔ گنگا مافیا، جیلانی مافیا کے خلاف حکومت سندھ نے بند کرانے کی حتی الامکان کوشش کی اور ہماری فورسز کو بھی سلوٹ کیا جائے کہ انہوں نے خاطر خواہ طور پر نوجوان نسل کو اس سے دور رکھنے اور اس زہر کو بند کرانے کی کوشش میں سینکڑوں کارخانے بند بھی کروائے اور فورسز کی جتنی تعریف کی جائے اتنی کم ہے لیکن ذرائع کے مطابق صرف 20 فیصد بیچنے والے پولیس، رینجرز سے چھپ چھپا کر اس زہر کو بیچ رہے ہیں مگر جیسے ان کو علم ہوتا ہے وہ ان کو قانون کے شکنجے میں جکڑ لیتے ہیں اور جیل کی ہوا کھلاتے ہیں۔ مگر صورتحال اب یکسر تبدیل ہو گئی جیلانی، ماوا، اور گنگا جیسے زہر کھانے والے عوام اب بازار میں جب زہر نہیں مل رہا تو عوام میں نہ کھانے کی وجہ سے بے چینی پھیل گئی اور فی پڑیا 100 روپے کردی گئی جس کے باعث چھالیہ کے ریٹ بھی آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ اور یہ ہی مافیا اب فی جیلانی 70 سے 100 روپے بیچ رہے ہیں اور یہ ایک اور مافیا معاشرے میں چھا گیا جسے جیلانی و گنگا مافیا کہا جانے لگا، اور اس زہر کے ہاتھوں سینکڑوں نوجوان اپنی زندگی کی بازی کینسر جیسے مہلک مرض میں ہتھا ر ہو کر ہار گئے اور سینکڑوں اسپتال میں زیر علاج ہیں اور وہ لوگ بھی ہیں جو متواتر اس زہر کا استعمال کر رہے ہیں اور ان کا منہ 80 فیصد بند کیا مگر پھر بھی کھانے سے باز نہیں اب تو عوام خود ہی لوازمات خرید کر اپنے گھروں میں اپنے لیے خود مرنے کا سامان یعنی زہر بنا کر کھا رہے ہیں اور بڑے فخر سے کہتے ہیں یار دیکھ میں نے کیسا زبردست ذائقہ بنایا ہے۔ اب حکومت، رینجرز، پولیس و دیگر محکمے کیا کریں۔ دراصل اب ہر ضروریات زندگی خواہ اس کا تعلق کسی بھی محکمے سے ہو اس کی مصنوعی قلت پیدا کر کے اور مافیا کے ذریعے خود ساختہ مہنگائی کر کے عوام تک پہنچانے کا کام اور مافیا کے ہاتھوں عوام کو یرغمال بنائے جانے کا عمل نہ جانے کب تک جاری وساری رہے گا اگر حکومت وقت اس ضمن میں مزید قانون پاس کر کے اس پر عملدرآمد کرائیں تو شاید کچھ بہتری آسکے ورنہ عوام اور ملک کا اللہ ہی حافظ ہے۔

نو پارکنگ سے آنے والی رقم شہر کے بلدیاتی نظام کی بہتری کیلئے خرچ کی جائے

شہر قائد میں جہاں نکاسی آب، پینے کے پانی کا مسئلہ، سڑکیں گلیاں اور شاہراہیں کھنڈرات کے ایکسٹرک کے ہاتھوں یرغمال عوام، پارکس اور کھیلنے کے میدان کچرا کنڈیوں میں منتقل ہونے جیسے مسائل سے دوچار ہے تو وہاں سب سے اہم مسئلہ پارکنگ اور ٹریفک جام ہونے کے باعث شہر قائد کے شہری سخت اذیت کا شکار ہیں۔ طارق روڈ، حیدری، برنس روڈ، لیاقت آباد، بوٹن مارکیٹ، جامع کلاتھ، لائٹ ہاؤس، صدر و دیگر مختلف مارکیٹوں میں کے ایم سی اور ڈی ایم سی کی پارکنگ موجود ہیں اور ان سے لاکھوں روپے کا ریونیو بھی حاصل ہو رہا ہے مگر یہ کہاں اور کس کی جیبوں میں جا رہا ہے یہ تو وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو ان کے ٹھیکیدار ہیں یا جنہوں نے انکو ٹھیکے پر دے رکھا ہے۔ ایک طرف کے ایم سی اور ڈی ایم سی کے افسران بڑے پیمانے پر پارکنگ کے حوالے سے ریونیو جنریٹ کر رہے ہیں۔ تو دوسری طرف کراچی کی تقریباً چھوٹی بڑی مارکیٹوں میں پارکنگ الاٹ ہونے کے باوجود بھی کراچی کے شہری نو پارکنگ پر اپنی گاڑیاں پارک کر کے بری الزمہ ہو جاتے ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹریفک پولیس کا محکمہ اپنے فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے مگر خاص کر نو پارکنگ پر کھڑی گاڑیوں چاہے اس میں موٹر سائیکل ہو یا کار اس پر فوری کارروائی کا کیا جانا اور فوری آجانا اس معاملے میں ٹریفک پولیس کی کارکردگی کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ادھر نو پارکنگ پر گاڑی کھڑی ہوئی ادھر ٹریفک پولیس کے اہلکار، جن کی فرشتے کی طرح نازل ہو گئے مقصد یہ نہیں کہ ٹریفک پولیس غلط کام کر رہی ہے مثال کے طور پر اگر ٹریفک اہلکار کسی بھی فرد کی (بائیک) موٹر سائیکل (اٹھا کر لے جاتے ہیں اور نہ جانے کتنے ہی نو پارکنگ پر ایسا ہوتا ہے اگر کسی کی موٹر سائیکل نو پارکنگ سے غائب ہو جاتی ہے تو اس شخص کو کیسے پتہ چلے گا کہ موٹر سائیکل چوری ہوئی ہے یا ٹریفک پولیس اہلکار اٹھا کر لے گئے ہیں۔ متاثرہ شخص پوچھتا ہوا ٹریفک چوکی پہنچ کر اپنے کاغذات دکھا کر موٹر سائیکل جرمانہ دے کر وصول کر لیتا ہے مگر نہ تو اس جرمانے کی کوئی سلپ ہے نہ وصول کنندہ گورنمنٹ کی جانب سے جرمانہ عائد کیے جانے کی رسید دیتا ہے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ گورنمنٹ کی جانب سے یا ٹریفک پولیس کی جانب سے کوئی ایسا قانون ہے یا قواعد وضوابط ہیں کہ نو پارکنگ پر کھڑی موٹر سائیکل، کار، ٹرک یا کوئی بھی وہیکل کی جرمانے کی ریٹ لسٹ ہو مگر تا حال یہ ہی عمل ہوتا ہوا آرہا ہے کہ نہ تو موٹر سائیکل نو پارکنگ کی جرمانے کی وصولی کی فیس اور نہ ہی کار کی جرمانے کی ادائیگی کی وصول کی فیس کی پرچی متاثرہ شخص کو دی جاتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ روزانہ کراچی شہر کے مظلوم عوام سے نو پارکنگ کی صورت میں کروڑوں روپے وصول کیے جا رہے ہیں مگر اس کی کوئی قانونی رسید نہیں اور نہ اس کا کوئی حساب کتاب ہے آخر کراچی کے مظلوم اور مسائل سے گھرے عوام کی محنت کی کمائی سے کمایا جانے والا پیسہ ٹریفک پولیس کس مد میں خرچ کر رہی ہے جسکی نہ کوئی رسید ہے اور نہ قانون، آخر یہ کس کے حکم پر اور کس کی جیب میں جا رہا ہے۔ اس مد میں روزانہ لاکھوں روپے کراچی کے عوام دے رہے ہیں وہ بھی غیر قانونی جرمانے کی صورت میں۔ دوسری طرف سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو لوگ ٹریفک پولیس کے ٹرک میں یا گاڑی میں سوار ہو کر گاڑیاں اٹھاتے ہیں کیا وہ لوگ ٹریفک پولیس اہلکار یعنی گورنمنٹ کے ملازم میں یا کسی ٹھیکیدار کے چوکیدار ہیں آخر یہ کون لوگ ہیں؟ اگر یہ ٹریفک اہلکار ہیں تو انکی وردیاں کہاں ہیں اور یہ وردی کیوں زیب تن نہیں کرتے؟۔ کچھ وقت پہلے ٹریفک پولیس کی جانب سے موٹر سائیکل کی تصویر کشی کر کے ایس ایم ایس کر کے بھیج دی جاتی تھی ان کا قانونی لائق تحسین تھا مگر اس پر بھی چند دن عمل ہوا مگر پھر وہی کہانی رام لیلا کی۔

اس ضمن میں یہ ہونا چاہیے کہ حکومت کی جانب سے قانون بنایا جائے اور موٹر سائیکل کار اور جتنے بھی وہیکل ہیں انکے حوالے سے نو پارکنگ جرمانے کا قانونی اور جرمانے کی قانونی ریٹ لسٹ تیار کی جائے اور کوئی ایسا کوڈ بنا دیا جائے جو کراچی کی ہر لائسنس والی اور بنا لائسنس پر آویزاں ہو اور اس بار کوڈ میں حامل گاڑی کا نام موبائل نمبر وغیرہ درج ہو اور ٹریفک پولیس اہلکار نو پارکنگ پر کھڑی کوئی گاڑی اٹھانے سے پہلے اس گاڑی کی تصویر ضرور کھینچیں اور اس کے مالک کو ارسال کریں اور جب مالک آئے تو اسے غلط پارکنگ کا ثبوت فراہم کریں اور اگر کسی گاڑی رکھنے والے کے پاس نقد رقم نہ ہو تو اس جرمانہ کو براہ راست ایکسائز ٹیکسیشن ڈیپارٹمنٹ ارسال کر دیا جائے جیسا کہ عرب امارات سمیت دیگر ممالک میں ہوتا ہے تاکہ جب مالک گاڑی کا ٹیکس یا ٹرانسفر کے لئے جائے تو پہلے وہ اپنی گاڑی پر واجبات ادا کرے پھر دیگر کارروائی کی جائے اس کے علاوہ جب مالک اپنی گاڑی وصول کرنے جائے تو اس کو جرمانے کی رسید اور جتنی رقم ادا کر رہا ہے اس کی رقم بھی اس پر درج ہو تا کہ نو پارکنگ کے جرمانے کی مد میں حاصل ہونے والی خطیر رقم کراچی کے کینٹوں کے بلدیاتی مسائل و دیگر کاموں کے حل پر خرچ کی جائے تاکہ کراچی کے غریب اور مظلوم عوام جو ٹریفک نو پارکنگ کی صورت میں لاکھوں روپے کا جرمانہ بھر رہے ہیں انکو بھی اس رقم کے کچھ ثمرات تو مل سکیں۔

کشمیر پر عالمی برادری کی مجرمانہ خاموشی

آبادی کا تناسب بدلنا خطرناک اقدام

کامران عباسی

جب میں چھوٹا تھا تو ریڈیو، ٹی وی پر نشر ہونے والی خبروں میں "عالمی برادری" کے الفاظ بار بار سنتا تھا۔ "عالمی برادری نے یہ کہا، عالمی برادری نے وہ کہا۔" "عالمی برادری ناراض ہے"، "عالمی برادری کا سخت ردعمل آیا ہے"... وغیرہ وغیرہ۔ کبھی کبھی عالمی برادری کا شکریہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔ عالمی برادری کو میں نے خود سے ہی موٹو کردار تصور کرلیا تھا۔

ذہن میں عالمی برادری کے عجیب وغریب خاکے بنتے اور مٹتے رہتے تھے مگر یہ خاکے ایک دبنگ عورت کے ہوتے جس کے مزاج ہی نہیں ملتے تھے۔ مجھے ان خاکوں میں اپنی ہیڈ مسٹریس کی جھلک آتی تھی جو ہر وقت ایک بڑا سا بید کا ڈنڈا لے کر سکول میں گھومتی رہتی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب سکولوں میں پیار نام کی چیز نہیں ہوا کرتی تھی، بس ماری مارتھی اور میڈم یا ہیڈ مسٹریس موقع پر ہی "انصاف" کی قائل تھیں۔ وہ بھی ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتی رہتیں، اکثر نامعلوم وجوہ کی بنا پر ناراض رہتیں اور ہماری استانیاں ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود ان کی شکر گذار نظر آتیں۔ کم از کم اس وقت مجھے یہی لگتا تھا۔

مگر دبنگ خاتون کا یہ تصور اس وقت چکنا چور ہو گیا جب میں نے اخبار پڑھنا شروع کیا۔ میں اس وقت چھٹی جماعت میں پہنچ چکا تھا اور اخبار میں دلچسپی ہو گئی تھی۔ عالمی برادری کبھی کسی بری بات پر خوش ہو جاتی تو کبھی اچھی بات پر ناراض، کشمیر کے معاملے پر عالمی برادری چپ سادھ لیتی تو بھارت کے ساتھ تجارت کے معاملے پر عالمی برادری پورے جوش وخروش کے ساتھ معاہدے کرنے پہنچ جاتی۔ کنفیوژن یہ تھی کہ ایک ساتھ ناراض، خوش، متفق اور تقسیم کیونکر ہوتی ہے، اس کے مفاد کا تعین آخر کس طرح ہوتا ہے اور معیار کیا ہے مگر بدلتے رہتے ہیں؟ یہ بات بہت دیر میں سمجھ آئی۔

بڑے ہوتے ہمیں بخوبی معلوم ہو گیا تھا کہ مسئلہ کشمیر عالمی برادری کا نہیں، ہمارا مسئلہ ہے اور اسے ہم نے ہی حل کرنا ہے۔ دھچکا اس وقت لگا جب دنیا

کے طاقتور ملک مشرقی تیمور اور دارفر کے معاملوں پر "عالمی برادری" بن گئے۔ یہ دونوں سیکی اکثریتی علاقے تھے اور یہاں کے عوام نے بالترتیب انڈونیشیا اور سوڈان کی مسلم آبادی کے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا اور علیحدگی کی تحریکیں شروع کر دیں۔

عالمی برادری بے چین ہو گئی اور انصاف، انسانی حقوق، اظہار رائے اور حق رائے دہی جیسی آوازیں اٹھنے لگیں جو وقت کے ساتھ شدید ہوتی گئیں۔ امریکا اور یورپی ممالک کی بڑی تعداد مشرقی تیمور اور دارفر کے علیحدگی پسندوں کی کھلم کھلا مدد کو نکل پڑے تھے۔

مغربی میڈیا کی "رپورٹنگ" لوگوں کو مسیحی علیحدگی پسندوں کی حمایت میں سڑکوں پر لے آئی اور پھر عالمی برادری نے آخر کار انڈونیشیا اور سوڈان کو مشرقی تیمور اور دارفر میں ریفرنڈم کرانے پر مجبور کر دیا۔ یوں تھوڑے ہی عرصے میں دنیا کے نقشے پر دو نئی ریاستیں وجود میں آ گئیں۔

مگر کشمیر جسے اقوام متحدہ نے خود رائے شماری کا حق دیا اس پر آج بھی کوئی ملک عمل درآمد کرانے کو تیار نہیں۔ بھارت نے پانچ اگست 2019ء کو آرٹیکل 370 ختم کر کے متنازعہ جموں وکشمیر کی خصوصی حیثیت واپس لی تو لگا شاید کوئی اس کھلی غنڈہ گردی کے خلاف آواز بلند کرے لیکن بے سود۔ پچھلے سوا سال سے وادی میں کرفیو نافذ اور کاروبار زندگی بند، لوگ گھروں میں نظر بندی کی زندگی گذار رہے ہیں مگر عالمی برادری نجانے کہاں سو رہی ہے؟

گزشتہ ماہ ایک رپورٹ منظر عام پر آئی کہ آسٹریلیا کے خصوصی فوجی دستوں نے 2005ء سے 2016ء تک افغانستان میں اپنے قیام کے دوران بچوں اور کسانوں سمیت 39 نہتے افغان شہریوں کو جان بوجھ کر قتل کیا۔ آسٹریلوی فوج کے چیف آف ڈیفنس فورس آنکس کیمبل نے رپورٹ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ قتل عام کے درجنوں واقعات ''میدان جنگ سے باہر'' کیے گئے تھے۔

رپورٹ کے مطابق خفیہ فوجی ٹیم نئے آنے والے سپاہیوں کو قیدیوں کو قتل کرنے پر مجبور کرتی تھی تاکہ وہ اپنا پہلا شکار کر سکیں۔ یہ ہولناک رسم خون بہانا کہلاتی ہے۔ واردات کے بعد یہ جونیئر فوجی واقعے کو جھڑپ بنا کر ظاہر کرتے تھے۔

رپورٹ میں ایک ایسے واقعے کا بھی ذکر ہے جب ٹیبل کا پٹڑ میں جگہ بنانے کے لیے آسٹریلوی فوجیوں نے ایک قیدی کو قتل کر کے پھینک دیا۔ مقتولین میں ایک چھ سالہ بچہ بھی شامل ہے۔ نہ جانے ایسے کتنے واقعات ہیں جو رپورٹ نہیں ہوئے۔

آسٹریلوی فوج کے سربراہ نے اپنے فوجیوں کے جنگی جرائم کا اعتراف کیا اور افغان عوام سے غیر مشروط معافی مانگی اور بتایا کہ ان کارروائیوں میں ملوث اہلکاروں کو سزا دینے کا فیصلہ خصوصی پراسیکیوٹر کرے گا کہ آیا انہیں سزا دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

سفاکی کی یہ داستان سامنے آئے کئی روز ہو گئے مگر کیا آپ میں سے کسی نے اقوام متحدہ، انسانی حقوق کی تنظیم یا کسی مغربی ملک کی جانب سے مذمت یا افسوس کا بیان سنا؟ یقیناً نہیں کیونکہ مظلوم مسلمان ملک کے غریب شہری ہیں جو قتل بھی ہو جائیں تو دہشت گرد ہی کہلائے جاتے ہیں۔

افغان عوام بے بسی سے جن الاقوامی طاقتوں کی جانب دیکھ رہے ہیں جو معاملے کو جلد از جلد دبا دینا چاہتی ہیں۔ ان کا رویہ اس خاموشی کے مترادف ہے جو انہوں نے مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزی پر اپنائی ہے۔ اس معاملے نے مجھے پھر بچپن کی یاد دلا دی۔ ''عالمی برادری خاموش ہے، اور یہ خاموشی نہ صرف سنگدلانہ بلکہ مجرمانہ بھی ہے''۔ یعنی عالمی نظام میں موجود بڑے ممالک جو اپنے آپ کو انسانی حقوق کا چیمپئن کہلاتے ہیں، وہ کشمیر میں بھارت کے سفاکانہ جرائم میں برابر کے شریک ہیں۔

ہندوستان میں برسر اقتدار مودی حکومت، آر ایس ایس کے مکروہ اور انتہا پسندانہ مسلم مخالف ایجنڈے کی تکمیل میں گامزن ہے۔ ہندوستان میں مسلم مخالف شہریت ترمیمی ایکٹ (ActAmendmentCitizenship)، مقبوضہ جموں وکشمیر کا غیر قانونی انضمام، بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کا فیصلہ، مسلمانوں کے جداگانہ عائلی قوانین کا خاتمہ، مقبوضہ جموں وکشمیر میں نئے ڈومیسائل قانون کی آڑ میں لاکھوں غیر ریاستی باشندوں کی آبادکاری، مقبوضہ جموں وکشمیر میں غیر انسانی لاک ڈاون اور بتدریج نسل کشی (Genocideincremental) یہ سارے اقدامات آر ایس ایس کے مسلم مخالف ایجنڈے کا حصہ ہیں۔ دفعہ 370 اور دفعہ 35-A کے خاتمے کے بعد ہندوستان نے مقبوضہ ریاست میں ہزاروں کی تعداد میں اضافی فوج تعینات کی ہے۔ اس وقت تقریباً 9 لاکھ بھارتی فوج نے مقبوضہ کشمیر میں ظلم و بربریت کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ 5 اگست 2019 کے بعد سے پوری مقبوضہ وادی بڑی انسانی جیل میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ذرائع ابلاغ اور مواصلات کے تمام رابطوں کو بند کر دیا گیا ہے اور ہر قسم کی مذہبی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور تعلیمی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ پبلک سیفٹی ایکٹ اور آرمڈ فورسز سپیشل پاور ایکٹ جیسے کالے قوانین کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے تقریباً چار ہزار سے زائد سیاسی قیادت کو نظر بند کر دیا گیا ہے اور تقریباً 14 ہزار نوجوانوں کو غیر قانونی طور پر گرفتار کرتے ہوئے جیس بے جا میں رکھا گیا ہے اور انہیں سنگین تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

> ہندوستان میں برسر اقتدار مودی حکومت، آر ایس ایس کے مکروہ اور انتہا پسندانہ مسلم مخالف ایجنڈے کی تکمیل میں گامزن ہے۔ ہندوستان میں مسلم مخالف شہریت ترمیمی ایکٹ (ActAmendmentCitizenship)، مقبوضہ جموں وکشمیر کا غیر قانونی انضمام، بابری مسجد کی جگہ رام مندر کی تعمیر کا فیصلہ، مسلمانوں کے جداگانہ عائلی قوانین کا خاتمہ، مقبوضہ جموں وکشمیر میں نئے ڈومیسائل قانون کی آڑ میں لاکھوں غیر ریاستی باشندوں کی آبادکاری، مقبوضہ جموں وکشمیر میں غیر انسانی لاک ڈاون اور بتدریج نسل کشی (Genocide incremental) یہ سارے اقدامات آر ایس ایس کے مسلم مخالف ایجنڈے کا حصہ ہیں

گذشتہ ایک سال کے عرصے میں سیکڑوں کشمیری نوجوانوں کو شہید کیا جا چکا ہے۔ مقبوضہ کشمیر میں مسلسل خوف کی فضاء طاری ہے، کشمیریوں کو روزانہ بدترین انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کا سامنا ہے۔ وادی کی مقامی این جی اوز جموں اینڈ کشمیر کولیشن فار سول سوسائٹی کے مطابق صرف 2020 کے پہلے 7 مہینوں میں 347 نوجوانوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔

دفعہ 370 اور 35-A کے خاتمے کا مقصد؟

دفعہ 370 اور 35-A کے خاتمے کے بعد ہندوستان مقبوضہ کشمیر کے اندر تیزی سے آبادی کے تناسب کو تبدیل کر رہا ہے تاکہ مقبوضہ ریاست کے مسلم تشخص کو ختم کرتے ہوئے مسلمانوں کی اکثریت کو اقلیت میں بدلا جا سکے۔ اس سارے عمل کا بنیادی مقصد جموں وکشمیر پر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے اطلاق کو ناکام کرنا ہے تاکہ رائے شماری کے عمل میں مسلم اکثریتی فیصلے کے امکان کو ختم کیا جا سکے۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے ہندوستان نے اس سال 27 جون سے مقبوضہ جموں وکشمیر کے ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کے حصول کے لیے آن لائن درخواستوں کا ایک تیز ترین نظام متعارف کروایا ہے جس کے ذریعے تقریباً 5 منٹ میں درخواست فارم مکمل کیا جا سکتا ہے۔ نئے ڈومیسائل قانون کے مطابق کوئی بھی غیر ریاستی شخص صرف 15 سال تک مقبوضہ ریاست میں رہائش پذیر رہنے پر اور تمام سرکاری ملازمین اور ان کے خاندان کے لوگ بشمول فوج کے ملازمین، صرف 10 سالہ خدمات کی انجام دہی پر مقبوضہ جموں و کشمیر کا ڈومیسائل سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے ہیں۔

ابھی تک صرف چار ماہ کے قلیل عرصے میں تقریباً 22 لاکھ درخواستیں جمع ہو چکی ہیں جن میں سے ساڑھے 18 لاکھ غیر ریاستی باشندوں، آر ایس ایس کے انتہا پسندوں اور قابض فوج کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ لوگوں کو مقبوضہ جموں وکشمیر کے ڈومیسائل سرٹیفکیٹس تقسیم کیئے جا چکے ہیں۔ اتنے کم عرصے میں ساڑھے اٹھارہ لاکھ ڈومیسائل سرٹیفکیٹس کی تقسیم سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ مودی حکومت کے مقبوضہ ریاست کے حوالے سے کیا مکروہ اور جارحانہ عزائم ہیں۔

مختصراً ہندوستانی منصوبہ ساز یہ چاہتے ہیں کہ:۔

۱۔ نئے ڈومیسائل قانون کے ذریعے تقریباً 50

لاکھ ہندوؤں اور غیر ریاستی باشندوں کو متبوضہ جموں وکشمیر کے ڈومیسائل سرٹیفکیٹس جاری کیے جائیں۔

۴۔ اگلے مرحلے میں لاکھوں ہندوؤں کی متبوضہ کشمیر میں آبادکاری کی جائے۔ چونکہ ڈومیسائل سرٹیفکیٹ کے حامل افراد متبوضہ کشمیر میں جائیداد خرید سکتے ہیں، ووٹ دے سکتے ہیں۔ لہٰذا خصوصی بستیاں آباد کر کے متبوضہ کشمیر میں آبادی کے تناسب کو تبدیل کیا جائے۔

۳۔ اس کے بعد ان نئی ہندو آبادیوں کو متبوضہ کشمیر کے اندر سرکاری ملازمتیں دینا تاکہ مقامی مسلمانوں کو معاشی اعتبار سے مزید کمزور کیا جاسکے۔

۴۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی کشمیریوں کے کاروبار کو تباہ کر کے نئی ہندو آبادیوں اور ہندوستانی سرمایہ کاروں کو متبوضہ کشمیر میں پروموٹ کرنا۔ کشمیر چیمبر آف کامرس کے مطابق 5 اگست 2019 سے لے کر آج تک مقامی تاجروں کو تقریباً 400 ارب روپے کا نقصان ہو چکا ہے جو کہ تقریباً 5.3 ارب ڈالر کے برابر ہے۔ اس کے نتیجہ میں متبوضہ کشمیر میں معاشی حالات انتہائی کشیدہ ہیں اور بے روزگاری میں شدید اضافہ ہو چکا ہے۔

۵۔ اگلے مرحلے میں متبوضہ جموں وکشمیر میں انتخابات کروا کر مودی حکومت بی جے پی کی حکومت بنوانا چاہتی ہے۔ تقریباً 50 لاکھ نئے ہندو ووٹرز کے ساتھ اور نئی حلقہ بندیوں کے بعد BJP کے لیے متبوضہ جموں وکشمیر میں حکومت بنانا آسان ہو جائے گا۔

۶۔ اس منصوبے کا سب سے اہم مقصد اقوام متحدہ کی قراردادوں کے اطلاق کو ناکام بنانا، تحریک آزادی کو ختم کرنا اور متبوضہ جموں وکشمیر کو مکمل طور پر عملاً ہندوستان میں ضم کرنا ہے۔ اگر کسی وقت اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدرآمد کے لیے عالمی دباؤ بڑھ جائے تو آبادی کا تناسب تبدیل کرنے کے نتیجہ میں ریاست کا فیصلہ اپنے حق میں کروایا جاسکے۔

ہندوستان کے متبوضہ کشمیر میں کیے گئے اقدامات اور ان کے ممکنہ اثرات کی مفصل منظر کشی کرنے کا مقصد مسلمان کشمیریوں کو درپیش خطرات کے تناظر میں بین الاقوامی قوانین کے مطابق مستقبل کے لیے موزوں اور قابل عمل سیاسی، سفارتی اور قانونی لائحہ عمل کا تعین کرنا ہے۔ متبوضہ جموں وکشمیر کے معروضی حالات کا تیزی سے بدلتے ہوئے علاقائی وعالمی سیاسی منظر نامے کے تناظر میں تنقیدی جائزہ لینے سے محتاط اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آنے والے ڈیڑھ سے دو سال انتہائی اہم ہیں اور اگر اس عرصے میں متبوضہ کشمیر کے اندر ہندوستانی

اقدامات کو روکا نہ گیا تو متبوضہ جموں وکشمیر کے مقامی باشندوں کا سیاسی، معاشی وثقافتی استحصال و دبنے پیسنے پر نسل کشی نوشتہ دیوار ہے۔ وادی کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کو اگر کم کر دیا گیا تو ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق کی خواہش اور کاوشیں کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔

جہاں ایک طرف متبوضہ کشمیر میں انتہائی خطرناک صورتحال ہے وہیں بہت سارے مثبت پہلو بھی ہیں:

سب سے پہلے، متبوضہ جموں وکشمیر کے بہادر اور غیرت مند مسلمانوں کا جذبہ حریت، نوجوانوں کی لازوال قربانیاں اور کشمیری ماؤں اور بہنوں کا بے مثال صبر اس تحریک کے پیچھے بنیادی قوت محرکہ ہے۔

اس کے علاوہ 5 اگست 2019 کے بعد بین الاقوامی میڈیا میں متبوضہ کشمیر کی کوریج، ایمنسٹی انٹرنیشنل اور دیگر انسانی حقوق پر کام کرنے والی تنظیموں کی مسئلہ کشمیر سے متعلقہ رپورٹس، اقوام متحدہ کے کشمیر برائے انسانی حقوق کی متبوضہ جموں وکشمیر میں ہندوستان کی طرف سے کی جانے والی انسانی حقوق کی پامالیوں پر دو مفصل رپورٹس اقوام متحدہ کے ملٹری ابزرور گروپ برائے انڈیا و پاکستان (UNMOGIP) کی رپورٹوں پر سلامتی کونسل کے مسئلہ کشمیر پر دو خصوصی اجلاس، کشمیری تارکین وطن (Diaspora) کا پوری دنیا بالخصوص یورپ، برطانیہ امریکہ اور کینیڈا میں مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے کے لیے اہم کردار، پاکستان کی عوام اور مسلح افواج کا کشمیریوں سے غیر

متزلزل تعلق وہ مثبت پہلو ہیں جو مسئلہ کشمیر کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

ہندوستان تمام تر فسطائی ہتھکنڈوں کے باوجود ناکام ہوگا:

تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ جہد مسلسل ہمیشہ کامیاب رہی ہے۔ مثلاً 1823 میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کر لیا۔ 1848ء میں فرانس نے الجزائر کے مقامی باشندوں کو پوچھے بغیر اسے فرانس کا اٹوٹ انگ صوبہ قرار دے دیا۔ گورے فرانسیسی جوق در جوق الجزائر میں آباد ہونے لگے۔ انہوں نے صنعت، زراعت اور معدنیات پر قبضہ کر لیا مگر الجزائری کبھی بھی فرانس کا قبضہ ہضم نہ کر سکے۔ چنانچہ ایک سو چوبیس برس بعد 1954ء میں الجزائر میں جذبہ حریت کا لاوا ابل پڑا۔ حریت پسندوں اور قابض فوج کے درمیان آٹھ سال تک جنگ رہی جس میں ایک ملین الجزائری اور ہزاروں فرانسیسی فوجی مارے گئے۔ بالآخر 1962ء میں الجزائری فرانس سے آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

اسی طرح 1975 میں پرتگال نے مشرقی تیمور کے جزیرے پر اپنا نوآبادیاتی قبضہ ختم کیا۔ مشرقی تیمور میں عیسائیوں کی آبادی تقریباً 8 لاکھ تھی۔ پرتگال کے بعد انڈونیشیا نے ایک سال بعد 1976ء میں اس پر قبضہ کر کے اسے اپنا 27 واں صوبہ قرار دیا مگر تیموریوں نے ہمت نہ ہاری اور بالآخر 1999ء میں اقوام متحدہ نے ریفرنڈم کرایا اور 99 فیصد آبادی نے آزادی کے حق میں ووٹ دے کر 2002 میں مشرقی تیمور کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے سامنے لایا۔

اسی طرح اسرائیل کب سے فلسطین کے بارے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کو مسترد کرتا چلا آرہا ہے۔ گولان پر قبضہ، مشرقی یروشلم کو اسرائیل میں ضم کرنے اور متبوضہ علاقوں میں یہودیوں کی آبادکاری بھی اسرائیلی قبضے کو جائز نہیں بنا سکتی۔

بھارت اس قوم کو کیا شکست دے گا جن کا جذبہ حریت تمام ہتھکنڈوں کے باوجود ماند نہیں پڑ سکا بلکہ اس میں مزید تیزی آتی جارہی ہے۔ کشمیری ہر صورت پاکستان سے الحاق چاہتے ہیں اپنا جینا مرنا پاکستان کیساتھ چاہتے ہیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ اپنی مذہبی پاکستانی پرچم میں پسند کرتے ہیں۔ ان شاء اللہ بہت جلد شہدا کا لہو قربانیاں جذبہ آزادی رنگ لائے گا اور کشمیر آزاد ہوگا۔

☆☆☆

ڈیٹا پرائیویسی اور سکیورٹی خدشات

شاہد بھٹی

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال کے ساتھ ساتھ صارفین کیلئے اپنی ذاتی معلومات کا تحفظ ایک مستقل مسئلہ بنتا جارہا ہے تاہم مزید غور طلب بات یہ ہے کہ اگلی دہائی تک یہ ایک مسئلے کی بجائے خطرے کا روپ دھار چکا ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ڈیٹا مختلف کمپنیاں غیر محسوس انداز میں اپنے پاس مسلسل محفوظ کررہی ہیں۔ ان کمپنیوں نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ہم صرف اپنے دوستوں کے ساتھ رابطے میں رہنے کے لیے، شہر کے آس پاس اپنا راستہ تلاش کرنے یا کوئی اپنی دلچسپی کی پراڈکٹ تلاش کرنے کے لیے جب ہم ہر نئے ڈیجیٹل ٹول کی خوبیوں کو سراہ رہے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے تازہ ترین اپیس کی باتیں کررہے ہوتے ہیں، کمپنیاں ہماری معلومات ہمارے خلاف استعمال کرنے کے لئے اربوں ڈالر کی جنگلی معلومات تیار کررہی ہوتی ہیں۔ ان کے نزدیک آپ بھی ایک پراڈکٹ ہیں جس کو انفارمیشن اکٹھی کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

یہ معاملہ ایک واقعے سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تقریباً ایک ماہ پہلے میں نے اپنے اینڈرائڈ فون میں ایزی پیسہ کا اکاؤنٹ بنایا۔ پہلے پلے سٹور سے ایپ ڈاؤن لوڈ کی اور دی گئی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس کو اپنے فون میں انسٹال کرلیا۔ اس کی تکمیل میں ایک مرحلہ انگوٹھا کی تصدیق کا تھا۔ وہ اس وقت نہیں کروایا کیونکہ اس کے لیے کسی شاپ پر جانے کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر اکاؤنٹ میں پیسے ٹرانسفر کئے جاسکتے ہیں لیکن نکال نہیں سکتے۔ ایک ٹرانزیکشن کرتے ہوئے کچھ پیسے بھی اس میں منتقل کیے۔ یہ کام میں نے اپنے فون سے کیا۔

اسی شام کو مجھے ایک دوست کی طرف سے فیس بک پر میسج ملا "بھائی جی کیسے ہیں، آپ کا کوئی ایزی پیسا اکاؤنٹ ہے؟ ایک ضرورت پڑ گئی تھی" جس دوست کی طرف سے یہ پیغام ملا وہ میرے لیے انتہائی قابل احترام شخص ہیں۔ میرے لیے حیرت اور پریشانی کی بات یہ تھی کے ان کو یہ کیسے پتا چلا کے میں نے ایزی پیسا اکاؤنٹ بنایا ہے۔

دوسری بات یہ کہ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ یہ پیغام ان کی طرف سے نہیں ہوسکتا۔ پیغام ان کا نہیں تھا تو اس کا مطلب ان کا اکاؤنٹ بھی کوئی اور استعمال کر رہا تھا۔ میں انفارمیشن ٹیکنالوجی سے بخوبی آگاہ ہوں اور جن کی کی طرف سے یہ پیغام تھا وہ بھی نہ صرف کمپیوٹر کے ایکسپرٹ ہیں بلکہ کسی یونیورسٹی میں کمپیوٹر ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ بھی ہیں۔ اس لئے ہم دونوں کو بخوبی علم ہے کہ فون میں وائرس بھی ہوسکتا ہے اور کوئی ایسی ایپلیکشن بھی ادارتاً یا اتفاقیہ طور پر انسٹال ہوسکتی ہے جو جاسوسی کا

کام کرتی ہو۔ تسلی کرنے کے لیے میں نے اپنے فون کو چیک کیا تو مجھے کوئی ایسی مشکوک ایپلیکشن فون میں نہیں ملی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب کیسے ممکن ہے کہ میری معلومات نہ صرف ریکارڈ ہوئیں بلکہ اس کی اطلاع ایک ایسے شخص تک پہنچادی گئیں جس کے پاس فیسبک کے کچھ اکاؤنٹس تک غیر قانونی رسائی تھی اور وہ یہ بھی جانتا تھا کے میری فرینڈ لسٹ میں کون کون موجود ہے۔ اس نے ان معلومات کو استعمال کرتے ہوئے ایک فراڈ کرنے کی کوشش کی لہذا میں نے اس میسج کا جواب نہیں دیا۔

اس واقعے سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آپ کی ذاتی معلومات کتنی محفوظ ہوتی ہیں۔ آپ جب اپنے نام کی سم اینڈرائڈ فون میں ڈال لیتے ہیں اور سائن اپ پراسیس مکمل کرلیتے ہیں اس دن سے آپ گوگل کو اجازت دے دیتے ہیں کہ آج کے بعد وہ آپ کی ہر سرگرمی پر نظر رکھ سکتا ہے اور وہ مسلسل اس کو ریکارڈ کرتا رہتا ہے۔ گوگل ہر ایک سیکنڈ کے بعد ایک ڈیٹا پیکٹ جس میں آپ کی لوکیشن، فون کی بیٹری کا سٹیٹس اور کچھ اور تفصیلات گوگل سرور کو بھیجتا رہتا ہے۔ اگر آپ انٹرنیٹ سے کنیکٹ نہیں ہوتے تو وہ یہ انفارمیشن فون میں محفوظ رکھتا رہے گا اور جب آپ انٹرنیٹ سے فون کنیکٹ کرینگے تو وہ یہ فون کی سٹوریج میں موجود ڈیٹا سب سے پہلے گوگل کو بھیجے گا اور بعد میں کوئی اور کام کرے گا۔

اس دوران اپڈیٹنگ یا اس طرح کا کوئی میسج آرہا ہوتا ہے۔ اگر آپ زیادہ عرصہ انٹرنیٹ سے کنیکٹ نہیں ہوتے تو کچھ ایپلیکشنز کام کرنا چھوڑ دیتی ہیں اور وہ آپ کو مجبور کرتی ہیں کہ آپ انٹرنٹ سے منسلک ہوں تاکہ وہ آپ کی محفوظ کی گئی ذاتی معلومات گوگل سرور تک پہنچا سکیں۔

فون جتنا اچھا ہوگا وہ اتنے بہتر طریقے سے آپ کی سرگرمیوں پر نظر رکھ سکے گا۔ جتنے فون کی ان پٹ کے ذرائع ہیں وہ تمام انفارمیشن کو اکٹھا کرنے کے لیے استعمال کیے جاسکتے ہیں۔ فون کا مائیک جو آواز کو ان پٹ کے طور پر لیتا ہے وہ بھی بات چیت کے علاوہ آپ کی ذاتی جاسوسی میں استعمال ہوتا ہے۔ آپ جو گفتگو کر رہے ہوتے ہیں اس کو پراسیس کرنے کے لیے لینگویج بنڈل، فون میں انسٹال ہوتے ہیں اور وہ آپ کی گفتگو چاہے وہ کسی لینگویج میں ہو اس کا فونیٹک ٹرانسکرپٹ بناتے رہتے ہیں اور اس ٹرانسکرپٹ میں سے خاص الفاظ جن کو کی ورڈز بھی کہا جاتا ہے، سلیکٹ کر کے مارکیٹنگ کمپنیوں سے شیئر کیے جاتے ہیں۔ جو بعد ازاں آپ کو ان سے متعلقہ اشتہارات، فیسبک، گوگل اور یوٹیوب یا جو بھی سوشل میڈیا کی ایپلیکیشن استعمال کرتے ہیں، وہاں پر نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔

آپ جو بھی چیز گوگل پر سرچ کرتے ہیں اس کے جواب میں جو آپ کو دکھایا جاتا ہے اس میں سے کچھ پرسنٹ صحیح ہوتا ہے باقی وہ دکھایا جاتا ہے جس کے لیے گوگل نے پیسے لیے ہوتے ہیں۔ جو لوگ سمجھتے ہیں وہ ان ویب سائٹ کو پہچان لیتے ہیں، جو نہیں سمجھتے ان کی سرچ کی سمت گوگل متعین کر رہا ہوتا ہے۔ گوگل یہ کیوں نہ کرے کیونکہ اس کی اربوں ڈالر آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ ہی سپانسرڈ سرچ ہے۔

آواز کے علاوہ امیج پراسیسنگ کے ذریعے آپ کی لی گئی تصاویر میں سے بھی جو معلومات ملتی ہیں وہ مصنوعی ذہانت استعمال کرتے ہوئے اس میں سے بھی مارکیٹنگ کی انفارمیشن لی جاتی ہے اور اس کو بھی بیچا جاتا ہے۔ آپ کس کس سے رابطے میں ہیں، کس سے کیا گفتگو ہوتی ہے، آپ کے فون میں کس طرح کے لوگوں کے نمبر محفوظ ہیں اور آپ کا اٹھنا بیٹھنا کن لوگوں کے ساتھ ہے، کس وقت آپ کہاں ہوتے ہیں اور اس کے علاوہ اور کچھ جو میں نہیں جانتا یہ سب آپ کے متعلق مسلسل ریکارڈ ہوتا رہتا ہے۔ فون آن ہے یا نہیں، اس سے قطع نظر آپ کا فون مسلسل آپ کی ہر طرح جاسوسی کرتا رہتا ہے۔

ایک مرتبہ سوچیں کہ پچھلے ایک سال آپ کیا کرتے رہے ہیں اور وہ سب کچھ گوگل کے پاس محفوظ ہو اور گوگل کی طرف سے آپ کو پیغام ملے کے آپ کا ڈیٹا ہمارے پاس محفوظ ہے لیکن اس کو سٹور رکھنے میں ہمارا خرچہ آرہا ہے۔ آپ کچھ پیسے دے دیں ورنہ آپ کا ڈیٹا پبلک کر دیا جائے گا۔ اس بات کی اجازت ان کو اینڈرائڈ فون استعمال کرتے وقت ان کو دے چکے ہوتے ہیں، قانونی طور پر بھی آپ ان کا کچھ نہیں کر سکتے۔

اس طرح کی جو اگلی چیز ہے وہ سمارٹ واچز ہیں یا فٹنس بینڈز ہیں۔ ان کا استعمال بتدریج بڑھتا جا رہا ہے۔ امریکہ میں ہر دسواں بندہ یہ فٹنس بینڈ استعمال کرتا ہے۔ یہ واچز خاموشی سے ایکسلرومیٹر اور گائرسکوپ سنسٹل اکٹھا کر کے ان کے مالکان کی جاسوسی کے آلات بن سکتے ہیں۔ اس آلے میں بہت سارے سینسرز ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر سطح سمندر سے اونچائی، ایئر پریشر، ہارٹ ریٹ کی شرح، بلڈ پریشر وغیرہ وغیرہ آپ کی ذاتی جسمانی معلومات اکٹھی کر کے شیئر کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر یہ اعداد و شمار انشورنس والی کمپنیوں سے شیئر کرنا شروع کر دیں تو کمپنیاں اس ڈیٹا کا غلط استعمال بھی کر سکتی ہیں۔

جب تک سموں کی بائیومیٹرک تصدیق نہیں ہوئی تھی، اس وقت کچھ فون ٹھیک کرنے والے سموں کی کاپی بنا کر رکھ لیتے تھے اور اس کو کبھی کبھار استعمال کر کے بیلنس منتقل کرنے یا کچھ غیر قانونی کام کرتے تھے۔ بعد ازاں بائیومیٹرک تصدیق کا عمل شروع ہو گیا۔ اب اگر آپ کی سم گم ہو جائے تو کسی بھی شاپ پر جا کر آپ پرانی سم کا آئی ڈی بلاک کروا لیتے ہیں اور دوسری سم کا آئی ڈی اپنے فون نمبر کے ساتھ منسلک کروا لیتے ہیں۔ اب جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم نے دو درجہ تصدیق اپنے فون پر آن کی ہوئی ہے تو اس وجہ سے ہمارے ڈیٹا تک رسائی ناممکن ہے اور وہ حکومت یا اپنے اداروں کے خلاف بے نامی اکاونٹ بنا کر دھڑا دھڑ غیر قانونی چیزیں شیئر کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے بھی عرض ہے کہ احتیاط کریں کیونکہ آپ کو تصدیقی پیغام آپ کی سم پر آتا ہے اور اگر کوئی ارباب اقتدار آپ کے نمبر کو تھوڑی دیر کے لیے کسی اور سم سے منسلک کر دے اور تصدیقی کوڈ موصول کر کے دوبارہ آپ کے نمبر کو پرانی سم سے منسلک کر دے تو آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا اور آپ کی انتہائی محفوظ معلومات تک رسائی ممکن ہو جائے گی اور اس کوڈ کو بعد ازاں آپ کے کسی اکاونٹ تک غیر قانونی رسائی قانونی طور پر بھی لی جا سکتی ہے۔

ٹیکنالوجی اس وقت زندگی کا ایک اہم ترین جزو بن چکی ہے اور اس کے بغیر گزارا ناممکن سا لگتا ہے۔ اس تحریر کا ہرگز مطلب یہ نہیں کہ آپ ٹیکنالوجی استعمال کرنا چھوڑ دیں۔ ہم بس ایسی ایپلیکیشنز جو بیلنک کے مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہیں ان کا استعمال بہت ہی ضرورت میں اور بہت ہی احتیاط سے کریں۔ کوئی بھی بات چیت سے پہلے یہ بات ذہن میں بیٹھا لیں کہ یہ ڈیٹا آپ کے فون کے علاوہ بھی کہیں نہ کہیں ایک اپ ہو رہا ہے۔ وہ معلومات اگر کسی غلط ہاتھوں میں آ کر اگر پبلک ہو گئیں تو وہ آپ کے لئے مسائل بنا سکتی ہے۔ تصویریں بناتے ہوئے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ تصویریں ساتھ ساتھ گوگل فوٹوز نامی ایپلیکیشن پر جا رہی ہوتی ہیں۔ تصویریں ہمیشہ کیڑوں میں بنائیں اور کسی بھی صورت اپنی پرائیوٹ تصاویر یا ڈیٹا کسی جانے یا ان جانے شخص کے ساتھ ہرگز شیئر مت کریں۔

خیبر ٹیچنگ اسپتال میں اموات، حکومتی کردار کہاں ہے؟

احتشام بشیر

خیبر پختونخوا میں 2013 میں جب تحریک انصاف حکومت بنانے میں کامیاب ہوئی تو اس وقت حکومت نے تعلیم اور صحت کے شعبوں میں اصلاحات کا عزم کیا۔ بڑے بڑے دعوے کیے گئے کہ صوبائی حکومت صحت کا نظام دوسرے صوبوں کی نسبت بہتر کر رہی ہے۔ وزیراعظم عمران خان کو بھی بتایا کہ سرکاری اسپتالوں کو شوکت خانم طرز پر ڈھالا جا رہا ہے۔ 2018 کے انتخابات میں جب پی ٹی آئی دوبارہ برسر اقتدار آئی تو حکومت نے سرکاری اسپتالوں کو مثالی قرار دیا۔ دعوے کیے گئے کہ اسپتالوں میں عوام کو صحت کی بہتر سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ صوبے کے تمام اسپتالوں میں مریضوں کو کوئی مسئلہ نہیں۔ صحت انصاف کارڈ کا میگا منصوبہ شروع کیا گیا۔ لیکن گزشتہ روز پشاور کے بڑے اسپتال خیبر ٹیچنگ میں آکسیجن نہ ہونے سے 8 افراد کے جاں بحق ہونے والے افسوسناک واقعے نے حکومتی کارکردگی کو صفر کر دیا ہے۔

اتوار کی صبح اطلاع موصول ہوئی کہ پشاور کے بڑے طبی مرکز خیبر ٹیچنگ اسپتال میں آکسیجن ختم ہونے سے متعدد مریض جاں بحق ہو گئے ہیں۔ اس خبر کی تصدیق کیلئے اسپتال انتظامیہ کے علاوہ حکومتی نمائندوں صوبائی وزیر صحت تیمور سلیم جھگڑا اور حکومتی ترجمان اطلاعات کامران بنگش سے رابطہ کرتے رہے لیکن کسی نے بھی فون اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ اسپتال کے ایک ذمے دار نے آکسیجن ختم ہونے سے چھ افراد کے جاں بحق ہونے کی تصدیق کی۔

جب معاملہ الیکٹرانک میڈیا اور سوشل میڈیا پر آیا تو حکومتی وزرا جاگے اور ٹویٹر اکاؤنٹ کے ذریعے وضاحتیں دینا شروع کر دیں۔

ہفتے کو رات گئے یہ افسوسناک واقعہ رونما ہوا۔ صبح 9 بجے تک معاملہ میڈیا پر آچکا تھا اور حکومتی وزرا نے دوپہر ڈھائی بجے اسلام آباد سے سرکاری ٹی وی کے ذریعے اپنی وضاحت جاری کی۔ دو گھنٹے کی مسافت پر وزیر صحت نے پشاور آنے کی زحمت تک گوارا نہیں کی اور معاملات اسلام آباد سے چلاتے رہے۔ اپوزیشن کا اس معاملے پر حکومت کو نشانہ بنانا فطری عمل تھا، لیکن سوشل میڈیا پر عوام نے اپنے غم و غصے کا اظہار کیا۔ رات گئے ہونے والے واقعے کے بعد اتوار کے روز کسی حکومتی نمائندے نے اسپتال کا دورہ نہیں کیا۔ اتنی زحمت نہیں کی گئی کہ اسپتال جا کر معلوم کیا جا سکے اتنے بڑے اسپتال میں آکسیجن ختم کیسے ہو گئی؟

اسپتال میں روزانہ آئی سی یو، سی سی یو اور ہنگامی شعبے میں مریض زیر علاج رہتے ہیں اور ویسے بھی کورونا کی وجہ سے آکسیجن کی ضرورت رہتی ہے۔ ہفتے سے اتوار کے درمیان بھی کورونا کے کئی مریض زیر علاج تھے، جن میں سے کچھ وینٹی لیٹرز پر بھی تھے۔ اسپتال ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آکسیجن ختم ہونے سے قبل ڈاکٹروں کی جانب سے انتظامیہ کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ آکسیجن ختم ہونے والی ہے، اس کا بندوبست کیا جائے۔ لیکن بروقت اطلاع کے باوجود آکسیجن بروقت مہیا نہیں کی اور اسپتال انتظامیہ کے مطابق تین گھنٹے تاخیر سے آکسیجن کی سپلائی فراہم کی گئی۔

1976 میں خیبر اسپتال کو ٹیچنگ اسپتال کا درجہ دیا گیا۔ اس اسپتال کا نام سابق وزیراعلیٰ حیات خان شیر پاؤ کے نام سے منسوب کیا گیا تھا اور یہ اسپتال شیر پاؤ کے نام پر ہی جانا جاتا ہے۔ پیپلز پارٹی کے دور حکومت کے بعد شیر پاؤ اسپتال کا نام تبدیل کر کے خیبر ٹیچنگ اسپتال رکھ دیا گیا۔ اس اسپتال کے نام پر بھی ماضی میں سیاست ہوتی رہی۔ 12 سو سے زائد بستروں کے اسپتال میں نصف صدی گزرنے کے باوجود اس کا اپنا آکسیجن نظام نہیں بنایا جا سکا اور باہر سے آکسیجن خریدی جاتی ہے۔

اطلاعات کے مطابق وزیراعلیٰ خیبر پختونخوا کو بھی اس افسوسناک واقعے کی اطلاع بروقت نہیں دی گئی، جس پر انہوں نے برہمی کا اظہار کرتے ہوئے انکوائری کا حکم دیا۔ انکوائری بھی اسپتال انتظامیہ کی جانب سے بنائی گئی کمیٹی نے تیار کر کے وزیراعلیٰ کو بھجوا دی گئی۔ رپورٹ میں مجرمانہ انتظامی غفلت کا انکشاف کیا گیا ہے۔

انکوائری کمیٹی رپورٹ کے مطابق اسپتال میں ایک ہزار گیلن کا آکسیجن کا پلانٹ ہے لیکن کوئی بیک اپ نہیں۔ اسپتال میں آکسیجن کے متبادل کے طور پر پرائمری اور سیکنڈری بندوبست ضروری ہے۔ آکسیجن سپلائی کرنے والی کمپنی کے ساتھ معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ نئے معاہدے سے متعلق کوئی دستاویزات نہیں۔ رپورٹ میں اسپتال ڈائریکٹر طاہر ندیم سمیت 7 افراد ذمے دار قرار دیے گئے، جنہیں فوری طور پر معطل کر دیا گیا ہے۔ واقعے کے وقت اسپتال میں 90 مریض آکسیجن وارڈ میں زیر علاج تھے۔

حکومتی رپورٹ میں بھی غفلت قرار دی گئی ہے اور اگر اسے مجرمانہ غفلت کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ابتدائی تحقیقاتی رپورٹ کے بعد حکومتی حلقوں سے یہ اطلاعات سامنے آ رہی ہیں کہ صحت کا قلمدان بھی نئے وزیر کو دیے جانے کا امکان ہے۔ واقعے کی اطلاع ملتے ہی اگر حکومت کی جانب سے فوری طور پر وزرا کو اسپتال بھیجا جاتا، متاثرہ خاندانوں کی دادرسی کی جاتی اور انکوائری رپورٹ تک وزیر صحت اپنا قلمدان چھوڑ دیتے تو یہ حکومت کی نیک نامی ہوتی۔

اس معاملے میں حکومت نے بھی غفلت کا مظاہرہ کیا ہے۔ جب کئی گھنٹوں تک حکومتی موقف سامنے نہ آیا، وزرا موبائل نہ اٹھائیں تو پھر حکومت کی ہی نااہلی سامنے آتی ہے۔ لیکن شاید ایسا لگ رہا ہے حکومت نے اس معاملے کو چھوٹا واقعہ سمجھ لیا ہے۔ جب اسپتالوں میں ہی مریضوں کو آکسیجن نہیں ملے گی تو انہیں علاج کیلئے کہاں جانا چاہیے؟ نظریں وزیراعلیٰ پر لگی ہوئی ہیں کہ وہ اپنی حکومت پر لگنے والے داغ کو کیسے دھوتے ہیں۔

کورونا وائرس کی دوسری لہر...

محمد علی افضل

ایک دوست کا قصہ ہے کہ اسے یہ شک لاحق ہو گیا وہ یرقان (ہیپاٹائٹس) کے مرض میں مبتلا ہے۔ انسانی دماغ کی یہ خاصیت ہے کہ جو شے اس سے ایک بار چپک جائے یا یہ جس موضوع میں دلچسپی لینے لگے تو دنیا مافیہا سے بے خبر اسی دھن میں مگن ہو جاتا ہے۔ بس چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے اسے وہی سوجھتا ہے یا یوں کہیے کہ ایک ہڑک سی اٹھتی ہے جو دیوانہ وار اسے اسی سمت سوچنے اور اسی کی ٹوہ میں سرگرداں رہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ اگر تو یہ لگن اور ہوک ترقی پسند ہو اور تخلیقی آئیڈیاز سے بھرپور ہو تو سبحان اللہ، انسان کے وارے نیارے۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایسوں کی ایسی قسمت کہاں؟ ہمیں تو خیالات جکڑتے بھی ہیں تو ایسے کہ جن کا بوجھ یا تو ہمارا دماغ اٹھائے یا پھر فقط منٹو کا قلم اور آج کے زمانے میں بلا تعطل تیز رفتار ان لمیٹڈ انٹرنیٹ۔ معاف کیجئے گا میں ادھر ادھر نکل جاتا ہوں۔

تو ہمارے دوست نے دن رات ہیپاٹائٹس کو اپنے اعصاب پر سوار کر لیا، جسے ملتا اسے بتاتا۔ جہاں کہیں کوئی معلوماتی پرچہ یا اشتہار دیکھتا رک کر آخری سطر تک یرقان کی تمام علامات، وجوہات اور احتیاطی تدابیر کے بعد پرنٹنگ پریس والوں کے نام تک پڑھ جاتا۔ احباب نے بہتیرا سمجھایا لیکن اس نے ماننے سے انکار کر دیا اور ٹیسٹ کرایا۔

ٹیسٹ تو ٹیگیٹو آیا مگر اسکی تسلی نہ ہوئی۔ وہ جس قدر ہیپاٹائٹس کی عمومی (جنرلائزڈ) علامات پر غور کرتا سبھی کو اپنے اندر موجود پاتا۔ پیلی آنکھیں، تکان، متلی وغیرہ وغیرہ۔ اس کو گمان ہوا کہ اس کے ٹیسٹ کی رپورٹ میں لیب والوں کو مغالطہ ہوا ہے یا پھر اس کا سیمپل کسی دوسرے صحت مند کے سیمپل کے ساتھ مکس اپ ہو گیا ہے، اسی لئے رزلٹ منفی آیا ہے۔ اگلے چھ ماہ اس نے اور زیادہ شدت سے ہیپاٹائٹس کے بارے میں سوچ بچار میں گزارے اور ایک بار پھر سے ٹیسٹ کرایا۔

اور یہ کیا؟ اس بار اس کا ٹیسٹ رزلٹ واقعی مثبت آ گیا۔

اب لگا یہ پریشان سا ہو کر پھرنے، قسمت اچھی تھی کہ ایک ماہر ہیپاٹولوجسٹ جو نفسیات سے بھی خاصی سوجھ بوجھ رکھتا تھا، کے ہتھے چڑھ گیا۔ اس نے اسکی پہلے تو ٹھیک ٹھاک کاؤنسلنگ کی۔ خوف اسکے دل سے نکال باہر کیا اور سمجھایا کہ ہر وقت اسکو دماغ اور اعصاب پر لینا بند کرے۔ ورنہ کل کا مرتا آج مرے گا۔ خوب اچھا صحت بخش معمول، صبح کی سیر، متوازن خوراک اور چند ضروری ادویات اسکو تجویز کیں اور یہ چند دنوں میں بھلا چنگا ہو گیا۔

ایک ایسی ہی پوری کیفیت کو معروف برطانوی مزاح نگار جیروم۔ کے۔ جیروم نے اپنے شہرہ آفاق مضمون "آ مین ہو واز آ ہاسپٹل" (A man Hospitalawaswho) میں ایسے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے جو کم و بیش ہم میں سے ہر ایک پر بالکل فٹ بیٹھتا ہے۔

اس مضمون میں بھی ایک شخص تمام بیماریوں کی علامات خود میں محسوس کرتا ہے ماسوائے گھٹنے کے درد کے لیکن جب ڈاکٹر کو بتاتا ہے تو وہ اسے سینے پر مارتا ہے اور صرف چند دوائیں، اچھی خوراک اور مناسب ورزشیں تجویز کرتا ہے جو کہ صحت کا اصل راز ہے۔

دراصل ہم جو بات بہت زیادہ سوچتے ہیں، ہمارا دماغ اسی قسم کے پیغامات ہمارے جسم کو بھیجنا شروع کر دیتا ہے۔ اسی قسم کے ہارمونز و نیوروٹرانسمیٹرز خارج کرنا شروع کر دیتا ہے۔ آپ ابھی مسٹر بین کی فلم لگا لیں ابھی وہ بیچارہ کوئی بیوقوفانہ حرکت کرے گا بھی نہیں کہ آپ ہنسنا شروع کر دیں گے۔ یہی حال دیگر "فلموں" کا بھی ہے۔

اسی طرح کہیں لڑائی ہو جائے، چاہے آپ بے حد تھکے ہارے اور بھوکے پیاسے کیوں نہ ہوں، ایکدم ایک برقی توانائی سی آپکے جسم میں بھر جائے گی۔ اس کو فائٹ اینڈ فلائٹ ری ایکشن کہتے ہیں۔ یہ ایڈرینالین نامی ہارمون کے اخراج کے باعث ہوتا ہے۔ یعنی جو ہم سوچتے ہیں دماغ اسکے مطابق عمل کرتا ہے اور ویسے اثرات آپکے جسم پر چھوڑتا ہے۔

ایک بات جو بہت اہم ہے وہ یہ کہ دنیا کی تمام معمولی، غیر معمولی قابل علاج اور لاعلاج بیماریاں، انکے جراثومے اور وجوہات ہمیں جان سے مار دینے کیلئے کافی ہیں۔ اور جب بیماری گلے پڑ آئے تو دنیا کی کوئی دوائی، کوئی حکیم کوئی، ڈاکٹر، کوئی ویکسین اور کوئی پلازما ناکام نہیں کرتا۔ یہ بات سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ آپکا کیا خیال ہے کہ ہم کسی ''سٹیرائیل (Sterile)'' ماحول میں سانس لے رہے ہیں جہاں مائکروبز کا وجود صفر فیصد ہے؟

یہ سموگ سے آلودہ زدہ فضا، یہ زہریلا پانی، یہ زہریلی خوراکیں اور سم قاتل ہمارا طرز زندگی۔

بیٹھے ہیں تو بیٹھے ہیں اٹھنے کا نام نہیں۔ اٹھیں گے نہیں بلکہ ٹانگیں پسار کر لیٹ جائیں گے۔ اس سب کے باوجود بھی ہم اگر صحت مند ہیں تو ہمیں رات دن اس خدا کا شکر ہونا چاہیئے کہ جس نے ہمیں اس قدر طاقتور اور ہماری سوچ سے بھی زیادہ ذہین مدافعتی نظام سے نواز رکھا ہے۔

دن بھر میں کروڑوں نہیں بلکہ کھربوں سے بھی زیادہ بیکٹیریا، وائرس، فنگس، سپورز، قاتل پروٹیز، کیمیکلز اور نہ جانے کیا کیا الا بلا ہمارے تھنوں، آنکھوں، دہن، مساموں اور دیگر حصوں سے جسم میں داخل ہوتے ہیں اور برق رفتاری سے مدافعتی نظام حرکت میں آتا ہے اور انہیں تباہ کر کے رکھ دیتا ہے۔

تو اصل چیز جس کی طرف بہت کم دھیان ہے وہ ہمارا مدافعتی نظام ہے۔ یہ ایک پورا اور انتہائی پیچیدہ نظام ہے کہ اگر اس پر لکھا جائے تو صرف اس نظام کے مختلف اجزا کو بیان کرنے کے واسطے ایک علیحدہ کتاب لکھنی پڑے۔ مختصراً یہ کہ مدافعتی نظام دنیا کے ہر جراثومے، کیمیکل، وائرس اور زہریلی اشیا کے خلاف قدرتی طور پر ویکسین اور ادویات ہمارے جسم کے اندر ہی تیار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور بیماریوں سے بچاتا ہے۔

یہ سب ویکسینز، اینٹی بائیوٹکس، اینٹی وائرلز وغیرہ مدافعتی نظام کو نقل کر کے ایجاد کی گئی ہیں۔ اب کورونا کی دوسری لہر جاری ہے۔ یہ وائرس اس صدی کی شاید سب سے مہلک وقاتل وباؤں میں سے ایک ہے۔ اس میں کوئی چند علامتوں کے بعد مکمل صحت یاب ہو رہا ہے، کوئی آکسیجن پر جا کر صحت یاب ہو رہا ہے۔ کسی کو پلازما لگانے کی نوبت آرہی ہے اور کوئی بیچارہ اس کا مقابلہ کرنے سے بالکل ہی عاجز ہے اور راہی عدم ہے۔

چھینکنا منع ہے

محمد کامران

کلاس روم میں بیٹھے بیٹھے اچانک سے چھوٹو کی ناک میں خارش ہوئی اور ایک دم کلاس کے کمرے میں جیسے بھونچال آگیا اور پورا کمرہ ''آں چھوؤ'' کی آواز سے گونج اٹھا۔ بس پھر کیا تھا، کلاس کے تمام بچے اس سے ایسے دور ہو گئے جیسے اس سے بدبو آرہی ہو۔ اور استاد صاحب نے فوراً اسے کلاس سے باہر جانے کا حکم جاری کر دیا۔ مگر پہلے اس کے ہاتھوں پر الکوحل ملا سپرے کرنا نہیں بھولے۔ اور پھر اپنے ہاتھوں پر خالص سینیٹائزر لگایا۔

بس میں جاتے ہوئے اچانک میرے گلے میں خراش ہوئی اور گلا صاف کرنے کے بہانے میں تھوڑا سا کھانسا اور جب اپنے اردگرد نظر اٹھائی تو پوری بس کے مسافر مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے میرے سر پر دو عدد سینگ نکل آئے ہوں۔

خدا غارت کرے اس کورونا کو، انسان کو جینے بھی نہیں دے رہا۔ پتہ نہیں ایسا کیا ہے کہ ایک خوف، دہشت جو لوگوں کے دلوں اور دماغ میں بٹھا دی گئی ہے۔ حالانکہ یہ وائرس تو کئی دہائیوں سے ہے بلکہ کئی صدیوں سے موجود ہے۔ نزلہ، زکام، کھانسی، بخار جیسی علامات تو پتہ نہیں کب سے چلی آرہی ہیں۔ اور اس کے علاوہ سب کو پتہ ہے کہ یہ ایک وائرس ہے جس کی زندگی کا دورانیہ سات سے پندرہ دن کا ہوتا ہے اور اس کے بعد یہ خود بہ خود ختم ہو جاتا ہے۔ اس کیلئے احتیاط تو ہوتی ہے مگر علاج نہیں۔ تو پھر آج انسان میں اتنی دہشت، اتنا خوف پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

پہلے چھینک آتی تھی تو ہمیں یہ سکھایا جاتا تھا کہ جب بھی چھینک آئے تو کہو ''الحمدللہ'' اور سننے والا کہے ''یرحمک اللہ'' اور چھینکنے والا پھر اس کا جواب دے۔ مطلب چھینک پر یہ بتایا گیا کہ شیطان کا ٹھکانہ ناک میں موجود گندگی ہوتی ہے، اس لیے جب چھینک آتی ہے تو شیطان بھاگ جاتا ہے، یعنی ناک کی گندگی صاف ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور اگر بار بار چھینکیں آرہی ہیں تو پھر نزلہ، زکام ہوا ہے اور نزلے کو پینے دو ورنہ دماغ پر جم جائے گا اور بال جلدی سفید ہو جائیں گے۔ کوئی دوا لینے کی ضرورت نہیں، بس جوشاندہ پی لو ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ تو بزرگوں کی باتیں ہیں، اللہ بہتر جانتا ہے کہ ان میں کتنی سچائی ہے مگر دعائیں تو اسلام ہمیں سکھاتا ہے اور احادیث کی روشنی میں یہ دعائیں سکھائی جاتی ہیں۔ پھر مسلمان اس موذی وائرس سے اتنا خوفزدہ کیوں؟

یوں تو حالات بہتر ہو رہے ہیں مگر اب حالات کے بہتر ہونے سے بھی ڈر لگتا ہے، کیونکہ عادت سی ہوتی جارہی ہے اب تو ان حالات کی۔ کوئی محفوظ نہیں، سبھی کو خطرہ ہے، کس سے مگر معلوم نہیں۔ ہر کوئی ڈر رہا ہے، کیوں؟ معلوم نہیں۔ کوئی کچھ بولنے کے قابل نہیں۔ کوئی کسی کو سنتا پسند نہیں کرتا۔ سب ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی اس دوڑ میں بھاگ رہے ہیں۔ کہاں جانا ہے کسی کو نہیں پتہ۔ اصلاح سب کو کرنی ہے مگر اپنی نہیں دوسروں کی۔ اس کورونا کے منظرنامے میں ہمارے دماغوں میں ایک ایسا ڈر پیدا کیا جارہا ہے جس کو نکالنا ہماری آنے والی نسلوں کیلئے بھی آسان نہیں ہوگا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ بھی دجال کی آمد کی تیاری ہے کیونکہ وہ کئی بیماریوں کا علاج کرے گا جو کہ لاعلاج ہوں گی۔ واللہ اعلم۔

مگر مجھے حیرت مسلمانوں کے طرز عمل پر ہوتی ہے، کیونکہ یہ تو اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرمان ہے کہ بیماری پیدا ہونے سے پہلے اس کا علاج دنیا میں بھیجا جاتا ہے۔ انسان اسے کھوجنے میں ناکام رہے تو اور بات ہے، مگر لاعلاج مرض اس دنیا میں صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے موت۔ اس لیے اگر ہم کسی کے چھینکنے یا کھانسنے سے ڈرنے کے بجائے اپنی موت کو یاد کر کے اپنی اپنی اصلاح کر لیں، تو بہ کر لیں، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ لیں، اپنے فرائض کو دل لگی سے سرانجام دیں، برائیوں سے اجتناب کر لیں، ایک دوسرے کا ہر دکھ تکلیف میں ساتھ دیں، سنتوں کو عام کریں، تو شاید کسی کو بھی یوں منہ چھپا کر پھرنے کی ضرورت نہ رہے۔ اور کوئی کسی کو چھینکنے پر یہ نہ کہے کہ بھائی اپنا کورونا ٹیسٹ کروا لو۔

بات وہی نظام مدافعت کی ہے۔ ہم نے اسے طاقتور بنانا ہے۔ ورزش، آٹھ سے دس گھنٹے کی پرسکون نیند (اگر موبائل اجازت دے دے تو) اور صحت بخش غذائیت سے بھرپور پھل اور سبزیوں پر مشتمل خوراک کو روزانہ کے معمولات میں شامل کرنا ہے۔

نظام مدافعت کا دماغ سے بھی بہت گہرا تعلق ہے۔ یقین جانیے ہمارا یہ دماغ اور اس میں چھپی بے پناہ طاقت ایسے ایسے حرکت انگیز کارنامے کر سکتی ہے جن کا ہم شاید تصور بھی نہیں کر سکتے۔ غیر ضروری سنسنی اور خوف کو ذہن سے نکال پھینکیں۔ ایک جگ اور گلاس کو بھی اگر دو تین گھنٹے اٹھا کر مسلسل کھڑے رہیں تو بازو شل ہو جائے گا۔ یہی حال خوف کرتا ہے اعصاب کا، دماغ کا اور قوت مدافعت کا۔

لیکن اسکا مطلب یہ بھی نہیں کہ ماسک پہننا، ہاتھ دھونا اور سماجی فاصلہ رکھنا چھوڑ دیں۔ حتی الامکان احتیاطی تدابیر ضرور اختیار کریں لیکن یاد رکھیں اس وبا کا اصلی مقابلہ لاشعور کی طاقت اور مدافعتی نظام اور سب سے بڑھ کر خدائے ذوالجلال والاکرام کے کرم سے ہی ممکن ہے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو، آمین۔

اداروں کی نااہلی یا انتظامیہ کا فقدان؛
موجودہ حکومت بھی خواب غفلت کا شکار

رپورٹ وتصاویر: ساگر راہی

کراچی کے علاقے کورنگی انڈسٹریل ایریا میں واقع شکر چورنگی تا شاہ فیصل کالونی کو جانے والا روڈ جہاں ہزاروں لوگ شاہراہ فیصل، ایئرپورٹ، ملیر، صدر، مارتھ کراچی، سہراب گوٹھ و دیگر علاقوں میں جانے کا راستہ اختیار کرتے ہیں اور انہی راستے پر موجود صورتحال یہ ہے کہ سیوریج کا نظام درہم برہم پڑا ہے۔ شکر چورنگی سے شاہ فیصل جوانے والے روڈ پر نکاسی آب کا حال بہت زیادہ خراب ہے۔ نالے کا پانی باہر سڑک پر آ گیا ہے جس کی وجہ سے صبح سے رات تک ٹریفک کی روانی متاثر رہتی ہے، اور اسی کی وجہ سے ٹریفک جام رہتا ہے۔ یعنی شکر چورنگی سے باغ کورنگی تک کا جو سفر ہے یہاں ٹریفک جام رہتا ہے اور موٹر سائیکل، کار رکشے اور ہیوی وہیکل اسی گندے نالے کے پانی میں سے اپنی گاڑیوں کو گزارتے ہیں۔ بس انتظامیہ اپنے اعلیٰ افسران سے مجبور ہے اور عوام موجودہ حکومت کی نااہلی سے مجبور ہے مگر کیا کریں جینا تو ہے اب چاہے نکاسی آب کا نظام درہم برہم ہو، ویسے تو عوام کی زندگی کے ساتھ ان گنت مسائل ایسے لپٹے ہوئے ہیں کن کن مسائل کا ذکر کیا جائے۔ عوام گھر میں رہے تو پانی، بجلی، گیس کے مسائل نے گھیر رکھا ہے اور اگر عوام ان مسائل سے گھبرا کر گھر سے باہر نکلتی ہے تو باہر سیوریج کا مسئلہ درپیش ہے کوئی گلی کوئی سڑک ایسی نہیں جہاں سیوریج کا سسٹم بدحالی کا شکار نہ ہو۔ اور یہ سڑک جس کے متعلق بات کی جارہی ہے تو یہ مین شاہراہ ہے اور یہاں کا حال

تصاویر میں دیکھ سکتے ہیں۔ مگر کیا کر سکتے ہیں کہ موجودہ حکومت بھی سابقہ حکومتوں کی طرح ہمارے سامنے وہی چہرہ لیکر پیش ہوئی جس سے ہم عوام اچھی طرح باخبر ہے۔ اعلیٰ افسران کے کانوں پر نہ تو جوں رینگتی ہے اور نہ وہ ابھی خواب غفلت کی نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ مگر کیا کریں جینا تو ہر حال میں ہے جہاں قدم قدم پر ایک نیا مسئلہ درپیش ہے وہی ایک اور ایسا مسئلہ عوام کو درپیش ہے جس کا ذکر نہ کیا گیا تو یہ مظلوم عوام کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ شکر چورنگی سے شاہ فیصل 2 نمبر جہاں یہ پل ختم ہوتا ہے اس پورے سفر میں دن کے اجالے میں عوام باحفاظت گزر جاتے ہیں مگر رات کی تاریکی میں گزرنے والی عوام اپنی قیمتی اشیا سے ہی محروم

ہوجاتے ہیں۔ جی ہاں۔۔۔ ایسا ہی خاص مقامات کی نشاندہی کی جارہی ہے، شگر چورنگی سے آتے ہوئے راستے میں ایک مزار شریف آتا ہے اسکے بالکل سامنے ایک راستہ اندر گوٹھ میں جاتا ہے یہاں کچھ پولیس اہلکار رات کی تاریکی میں کھڑے ہوتے ہیں جو ہر آنے جانے والے شہر کو

روکتے ہیں اب یہاں کھڑنے کی کیا وجہ ہے یہ تو وہی جانتے ہیں مگر اکثر و بیشتر دیکھا گیا ہے کہ موٹر سائیکل سواروں کو روک کر انکی چیکنگ کی جاتی ہے اور ان سے رقم کا مطالبہ کیا جاتا ہے مگر بڑی ہیوی وہیکل سے مطالبہ نہیں کیا جاتا بلکہ وہ طے شدہ بات ہے کہ رشوت دیئے بغیر یہاں سے آگے نہیں جاسکتے۔ ہماری پولیس کا یہ حال ہے کہ انہیں گورنمنٹ سے تنخواہ نہیں ملتی بس یہ غریب لوگ اپنا گزر بسر شہریوں سے رشوت لیکر کرتے ہیں۔ سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ان پولیس اہلکار کی سربراہی ان راہزنوں، ڈکیتوں کو حاصل ہے جو دیدہ دلیری سے شہریوں کو لوٹتے ہیں، بس انکے ہاتھوں یرغمال غریب عوام ہی بنتے ہیں مگر ڈکیتوں کے یہ رکھوالے ہیں کیونکہ ڈکیتوں کے مال میں انکا بھی حصہ ہوتا ہے۔ یہ تو ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے اب اسی روڈ پر آگے چلتے ہیں جہاں شگر چورنگی سے کورنگی پانچ نمبر کا راستہ ہے۔ یہ اس سے بھی خطرناک ہے کیونکہ شگر چورنگی پر انٹرنیشنل ایئرپورٹ لگتا ہے مگر یہاں کوئی پولیس اہلکار نظر نہیں آتے۔ ہمارے شہر کراچی کو جو حال ہے اس پر کچھ لکھنا اب محال ہوگیا، کہنے کو تو ہم اسلامی جمہوریہ پاکستان کے باشندے ہیں اور ایک آزاد ملک میں رہ کر بھی

ڈر اور خوف کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، اب نہ تو اسلامی جمہوریہ پاکستان رہا اور نہ ہی روشنیوں کا شہر کراچی رہا، آج عوام کی آواز کیا کون سنے گا، عوامی مسائل کون حل کریگا، یہ مظلوم اور حالات کے ستائے ہوئے عوام کس ادارے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اپنے مسائل کی روداد کس کو سنائیں، حالات کے ستائے ہوئے عوام آج محمد بن قاسم کے منتظر ہیں کہ اس جیسا مرد قلندر ہمارے اداروں میں آکر بیٹھ جائے اور ان اداروں کو چلانے والے مگرمچھوں کو لگام ڈال دے، کالی وردی میں ملبوس بھیڑیوں کے گلے میں پٹہ ڈالے، تاکہ حالات کے ستائے ہوئے عوام پھر سے اپنا سر اٹھا کر جی سکیں، اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کرسکیں۔ وہ وقت بھی تھا جب شہر کراچی میں امن و امان، بھائی چارگی اس کے ماتھے کا جھومر ہوا کرتا تھا مگر اب حال یہ ہے کہ جیسے کسی بیوہ عورت کے سر سے چادر اتار کر اس کی عزت کو داغ دار کردیا ہو بس یہ ہی حال میں کراچی شہر کا ہوگیا ہے۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا، اب بھی وقت ہے ہمارے ادارے کے افسران، موجودہ حکومت بالخصوص وزیراعظم عمران خان صاحب اس ملک بالخصوص شہر کراچی سے مخلص ہوکر کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے عوام خوشحال ہو اور جن مسائل سے دوچار ہے ان سب سے انھیں چھٹکارا مل سکے، ورنہ وہ وقت دور نہیں کہ جب ہماری داستان بھی نہ ملے گی داستانوں میں۔۔۔۔۔!

AN LAW ASSOCIATES

Advocates & Legal Consultants

Civil, Criminal, Family & Corporate

Contact :

0332-2106386 / 0300-8200997

Office / B-6, 3rd Floor . Ali Centre Main University Road
Block13-C Gulshan-e-iqbal

خواتین کی ترقی لیکن استحصال کے ساتھ

راضیہ سید

"خواتین آج کل ہر شعبہ زندگی میں کام کر رہی ہیں اور اپنی قابلیت کا لوہا بھی منوا رہی ہیں"۔ یہ جملہ زبان زد عام ہے اور کسی حد تک درست بھی ہے لیکن کیا حقیقی معنوں میں اس پر عمل ہوتا بھی ہے؟ اس سے کم از کم میں تو متفق نہیں کیونکہ تمام ہی شعبہ جات میں جنسی ہراسگی تو ایک طرف رہی، امتیازی سلوک اور کردار کشی، جنسی ہراسانی سے بھی زیادہ سنگین صورتحال اختیار کر چکی ہے۔

یہ بات ماننے والی ہے کہ کارپوریٹ سیکٹر بہت ہی سنگ دل ہے، اب چاہے وہ سرکاری نوکری ہے یا پرائیویٹ سیکٹر، جہاں معمولی سی لغزشوں پر بھی نوکری سے بے دخل کر دیا جاتا ہے اور کسی مجبور انسان کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔

انسان اب تک اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے لیکن خواتین کو مردوں کے مقابلے میں دگنی جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے یہی تلخ حقیقت ہے۔ ملازمت پیشہ خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک درحقیقت جنسی ہراسانی سے بھی زیادہ خطرناک ہے لیکن قابل افسوس یہ ہے کہ ہم صرف جنسی ہراسگی پر ہی بات کر کے اصل مسئلے سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ ابھی تک ہم اس امتیازی سلوک جیسے مسئلے کا کوئی حل نہیں ڈھونڈ سکے تو خواتین کو مساوی وسائل کیا فراہم کریں گے اور کیسے انھیں قومی دھارے میں شامل کریں گے؟

ہمارے ہاں دفتروں میں خواتین کو اعلیٰ عہدے تو دے دیئے جاتے ہیں لیکن ان کی قابلیت پر ہمیشہ سوال اٹھایا جاتا ہے، مزید یہ کہ ان کی خوبیوں کا کبھی اعتراف نہیں کیا جاتا۔ ہمیشہ یہی سوچا جاتا ہے کہ یہ خاتون (یقیناً بدعنوان اور بدکردار ہے جس نے یہاں تک پہنچنے کے لئے اپنی مرضی سے اپنی عزت داؤ پر لگائی ہے۔

کوئی یہ نہیں سوچتا کہ یہ خاتون اپنی محنت کے بل بوتے پر اس مقام تک پہنچی ہے بلکہ یہاں تک باتیں کی جاتی ہیں کہ آج کل تو لڑکیاں اپنی حرکات وسکنات سے من پسند پروفیسروں سے اپنی مرضی کے نمبر بھی لگوا لیتی ہیں اور اب میرٹ کا زمانہ ہی نہیں رہا۔

> انسان اب تک اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا ہے لیکن خواتین کو مردوں کے مقابلے میں دگنی جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے یہی تلخ حقیقت ہے۔ ملازمت پیشہ خواتین کے ساتھ امتیازی سلوک درحقیقت جنسی ہراسانی سے بھی زیادہ خطرناک ہے لیکن قابل افسوس یہ ہے کہ ہم صرف جنسی ہراسگی پر ہی بات کر کے اصل مسئلے سے نظریں چرا لیتے ہیں۔ ابھی تک ہم اس امتیازی سلوک جیسے مسئلے کا کوئی حل نہیں ڈھونڈ سکے تو خواتین کو مساوی وسائل کیا فراہم کریں گے اور کیسے انھیں قومی دھارے میں شامل کریں گے؟

اس سارے عمل میں زیادہ تر ان خواتین کے مقابلے میں نچلے عہدوں پر کام کرنے والے افراد شامل ہوتے ہیں جن کا کام یعنی شے ایک طرح سے کھوج لگانا کہا جا سکتا ہے وہی ہوتا ہے۔ ایسے افراد ان خواتین کی سامنے تو بہت تعریف کرتے ہیں لیکن درپردہ کسی نہ کسی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کب باس کے سامنے ان کی کارکردگی کو منفی انداز میں پیش کیا جائے۔ ماحول کو اس طرح سے بنا دیا گیا کہ وہ کوئی بھی کام نہ کر سکیں یا باس کے ساتھ ان کا کیٹفل بنا دیا گیا تاکہ وہ اپنی بدنامی کے ڈر سے نوکری چھوڑ دیں اور نااہل خواتین کے لئے راہیں ہموار ہو سکیں۔ کئی مرد حضرات تو ایسے ذہین ہوتے ہیں جو نہ تو قابل خواتین کی ذہانت کو تسلیم کرتے ہیں اور نہ ہی خاموش رہتے ہیں بلکہ ہر جگہ وہ بانگ دہل یہ کہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ جناب آپ کو تو کچھ آتا ہی نہیں آپ کو تو خاتون ہونے کی بنا پر فوقیت دی گئی ہے۔ یا یہ کہ یہاں پہلے تو اس سیٹ کا وجود ہی نہیں تھا جس آپ کے آنے کی دیر تھی کہ باس نے اس سیٹ کی بھی گنجائش نکال لی۔

اسی طرح اگر باس موجود نہ ہوں تو ایسے نچلے درجے کے افسران خاتون کا جینا محال کر دیتے ہیں۔ انھیں کراس ٹاک کے ذریعے کسی بھی گفتگو مذاق کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مختلف انجان نمبروں سے مکار اور نامناسب میسجز بھیجے جانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

دوسرا خواتین کو تنخواہ بھی کم دی جاتی ہے، وہ دفتری کام بھی زیادہ کرتی ہیں اور ان کے اضافی کام کا کریڈٹ بھی بہت آسانی سے مرد حضرات لینے لگتے ہیں۔ یہ صورتحال بھی ایسی محنتی خواتین کے لئے سردردی کا باعث بننے لگتی ہے اور وہ دلبرداشتہ ہو کر باوجود باصلاحیت ہونے کے نوکری ہی چھوڑ دیتی ہیں۔

پنجابی زبان کا ایک مشہور محاورہ ہے کہ "کہکر اں تی نوں تے سناڑاں توہنوں" یعنی بات بھی کر دو کہ پتہ بھی چل جائے اور آپ کسی کی نظروں میں قصوروار بھی نہ ٹھہریں۔ کسی کو بات سنا بھی دیں اور کسی دوسرے کو بھی علم نہ ہو کہ یہ کارنامہ آپ کا ہے۔ سو خواتین پر اس طرح سے جملے کسے جاتے ہیں کہ لوگ تو پیٹھ ہی کی طرح اچھے لگ رہے ہیں میرا تو کھانا کھانے کا موڈ ہو رہا ہے۔ آج باس آئے نہیں اور آپ آ گئیں بھئی آپ تو خود باس ہیں یہ پورا دفتر ہی آپ کا ہے۔ آپ نہ آئیں میٹنگ لیٹ لے لیں لوگ پورا دفتر ماموں بننے والا ہے۔

خواتین کا مذاق اڑانا، ان پر جملے کسنا، ان کی توہین کرنا، معذرت کے ساتھ یہ ایٹی کیٹ کبھی تبدیل نہیں ہو گی۔ میں نے بہت سے سوئنڈ یوئنڈ افراد کو بھی خواتین کے ساتھ بدسلوکی کرتے دیکھا ہے۔ اپنے سے سنیئر اور اعلیٰ عہدے پر فائز خواتین کا مذاق اڑاتے دیکھا ہے لہٰذا اس ترقی یافتہ دور میں بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ خواتین کی ترقی کے دعوے صرف دعوے ہی ہیں، ان میں حقیقت صرف اتنی ہے کہ خواتین کی ترقی استحصال کے ساتھ ہو رہی ہے۔

کیا ہمیں ہراسگی کی طرح اس مسئلے کو بھی حل کرنے کی ضرورت نہیں، کیا اس سنجیدہ ایشو کیلئے قانون سازی نہیں ہونی چاہیئے، یہ سوال عوام کے ووٹوں سے اقتدار کے ایوانوں میں پہنچنے والوں پر چھوڑتے ہیں خصوصاً ان خواتین اراکین پارلیمان پر جو خواتین کی ترقی اور ان کے حقوق کی بالادستی کے بیانات تو خوب ٹھوک بجا کر دیتی ہیں لیکن عملی طور پر کیا کرتی ہیں، وقت خود بتا دے گا۔

عورت کی عزتِ نفس

پاکستان میں روز نجانے کتنی خواتین ظلم کا شکار ہوتی ہیں

ڈاکٹر زمرد اعوان

ستمبر کی ایک رات لاہور سے گوجرانوالہ کو ملانے والی سڑک پر اپنے تین بچوں کے سامنے تشدد اور زیادتی کا شکار ہونے والی خاتون کے واقعے نے پورے ملک کی اخلاقی و انتظامی کمزوری کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ خواتین کے ساتھ زیادتی کے واقعات پہلے بھی رونما ہوتے رہے ہیں۔ لاہور کی پولیس کے مطابق 2020 کے پہلے 60 دنوں میں خواتین سے زیادتی کے مجموعی 73 واقعات درج ہوئے۔ اس سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ مطلع نہ کیے جانے والے واقعات کی تعداد کتنی زیادہ ہوگی؟ لیکن موٹروے زیادتی کیس دو پہلوؤں کی وجہ سے اپنی نوعیت کا انوکھا واقعہ ہے۔ ایک اس میں تین معصوم بچوں کے سامنے ان کی ماں سے زیادتی کی گئی۔ دوم اس واردات سے پہلے قانون نافذ کرنے والے اداروں سے مدد مانگی گئی، جس کا نہ پہنچنا اس سانحے کا باعث بنا۔

اس واقعے پر ردعمل کے طور پر تمام سماجی تنظیمیں معاشرے میں پنپنے والی پدرانہ سوچ کی طرف انگلی اٹھا رہی ہیں۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو اس کی وجوہات اس سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ بلاشبہ معاشرہ تو پدرانہ سوچ کا حامل ہے ہی، لیکن کیا ہم نے یہ سوچا ہے کہ بچے کی پہلی درس گاہ تو ماں ہوتی ہے، دوسری اس کے گھر کا ماحول۔ معاشرے کا کردار تو بہت بعد میں آتا ہے۔ جو خیالات ماں رکھتی ہے وہی بچے (چاہے لڑکی ہو یا لڑکا) کے ذہن میں تاحیات نقش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح گھر میں جس طرح سے بیٹے اور بیٹی کو صنفی تفریق سے پالا جاتا ہے وہ ان کے طرزِ عمل کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہمیں ماؤں سے سوال کرنا چاہیے کہ وہ ایسی تربیت کیوں کرتی ہیں، جس میں بیٹے کو تو جسمانی، ذہنی اور سماجی تحفظ کا درس جبکہ بیٹی کو ہر ظلم پر خاموشی، صبر اور درگزر کرنے پر راضی کیا جاتا ہے؟ یہی وہ صنفی تفریق ہے جو آگے چل کر زیادہ تر مردوں کو ظالم اور عورتوں کو مظلوم بناتی ہے۔ یہ سلسلہ محض خاندان میں ہی تعلقات تک ہی محدود نہیں رہتا، بلکہ یہ معاشرے میں بھی اس طرح سے منتقل ہوتا ہے کہ مرد سڑک پر موجود عورت کو کمزور اور تنہا سمجھتے ہوئے مختلف مظالم کرنے کو اپنا حق گردانتا ہے۔ جیسے کہ موٹروے کیس سمیت عورتوں پر معاشرے میں تیزی سے پھیلتے زیادتی اور ہراسگی کے واقعات سے ظاہر ہے۔

دوسری اہم وجہ مذہب کی غلط تشریح ہے۔ جس کو بنیاد بنا کر جابجا صنفی تفریق کو جائز بنایا جاتا ہے۔ اس ضمن میں ازواجِ مطہرات رسول، حضرت خدیجہ اور حضرت عائشہ کی پاک دامنی کی مثال تو دی جاتی ہے، لیکن ان دونوں خواتین کا اسلامی تاریخ میں فیصلہ سازی، خودمختاری اور اصول پرستی کے حوالے سے زیادہ ذکر نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح اسلام میں خواتین کے کردار کی مثال دیتے ہوئے حضرت زینب کا یزید کے دربار میں اُس تاریخی خطبے کا حوالہ کم دیا جاتا، جس میں ظالم کو للکارا جا رہا ہے اور پورا خاندان لٹانے کے باوجود بھی حق و سچ کا فرق بتایا جاتا ہے۔ وہ بھی ایک خاتون تھیں جن کو اسلام نے نہ تو جھکنا سکھایا اور نہ ہی ڈرنا۔ تو اس مذہب کے پیروکار کیسے ایک اسلامی معاشرے میں ظلم کے سامنے خواتین کو خاموش رہنا اور جھکنا سکھا سکتے ہیں؟

تیسرا اہم پہلو، عورت کو عصمت کا نشان کچھ اس طرح بنا دیا ہے کہ وہ اپنے ساتھ زیادتی کا ذکر کرتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ ایسا کرنے سے وہ عزت دار نہیں رہے گی۔ کیونکہ اسے عزت کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ اسی خوف سے زیادہ تر خواتین اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کا ذکر نہیں کر سکتیں۔ موٹروے پر زیادتی اور تشدد کا واقعہ تو ایک ایسی خاتون کے ساتھ ہوا جس کا تعلق ایک متوسط گھرانے سے تھا، اس وجہ سے نہ صرف کیس درج ہوا بلکہ دیکھتے ہی دیکھتے قومی و بین الاقوامی منظرنامے پر بھی چھا گیا۔ کتنی ہی خواتین ہیں پاکستان میں جو روزانہ گھر میں یا گھر سے باہر ایسے ظلم کا شکار ہوتی ہیں؟ لیکن غریب گھرانوں سے تعلق کی وجہ سے اپنے ساتھ روا ظلم کا ذکر صرف اور صرف کسی سے اس لیے نہیں کرتیں کہ کہیں معاشرے میں مقام اور گھرانے میں اپنی عزت نہ کھو بیٹھیں۔

اس بحث کا چوتھا اہم پہلو، خواتین کے مساوی حقوق کے متعلق جلوسوں اور بحثوں میں مردوں کی اکثریت کی عدم موجودگی ہے۔ معاشرہ تو دونوں کا اس مسئلے پر کردار مانگتا ہے۔ جب تک خواتین کے حقوق کی ہر تحریک میں مرد باقاعدہ شامل نہیں ہوگا، تب تک کوئی اہم پیش رفت ممکن نہیں۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گی کہ پاکستانی معاشرہ نہ پدرانہ ہونا چاہیے اور نہ مدرانہ، یہ صرف ایک انسانی معاشرہ ہونا چاہیے، جہاں صنف کی بنیاد پر نہیں بلکہ انسانیت کی بنیاد پر عفو و درگزر، عزت و احترام اور حقوق کا تحفظ ہو۔ جہاں کوئی مرد عورت کو اس وجہ سے ہراساں نہ کرے کہ وہ عورت ہے اور انکار نہیں کر سکتی۔ جہاں عورت بھی مرد کو سماجی و معاشی دباؤ سے آزاد کر کے ایک انسان سمجھے۔ جب تعلقات کی بنیاد باہمی رضامندی ہو سکتی ہے، تو ختم کرنے کا اصول بھی باہمی احترام اور عزت ہونا چاہیے۔

بدلے کی آگ میں سلگتا ہمارا معاشرہ

ڈاکٹر بشال ندیم

پچھلے دنوں تربت میں جرنلسٹ شاہینہ شاہین بلوچ کو گولی مار کر قتل کر دیا گیا۔ وہ ایک آرٹسٹ، بلوچی میگزین کی ایڈیٹر اور ٹی وی ہوسٹ بھی تھیں۔ ابتدائی طور پر یہ سامنے آیا کہ اس کے سابقہ شوہر نے ہی اسے جان سے مار دیا۔ یعنی عزت کے نام پر ایک اور عورت جان سے گئی۔ ایک مرد سے یہ برداشت نہیں ہوا کہ اس سے علیحدگی کے بعد شاہینہ نہ صرف خوش تھی بلکہ اپنی زندگی میں آگے بھی جا رہی تھی۔

ابھی کچھ دن پہلے کراچی میں ایک موٹر سائیکل سوار کو روکا جاتا ہے، موبائل چھینا اور پھر گولیاں مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ یہ بظاہر ڈکیتی کی واردات لگی، لیکن سی سی ٹی وی کی مدد سے پولیس نے ملزمان کو شناخت کیا تو کہانی کچھ اور ہی نکلی۔ مقتول کا نام مدیف تھا، جس کی کچھ عرصے قبل شادی ہوئی، اس کی ایک دوست تھی جس سے شادی کرنے کا وعدہ تھا، لیکن شادی کہیں اور کر لی۔ شادی کے بعد لڑکا لڑکی کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا، نہ ہی اس سے شادی کرنی تھی، بلکہ اسے اس کی تصویروں کے حوالے سے بلیک میل کرنے لگا، جب اس نے بھی آگے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان سب سے تنگ آ کر لڑکی نے قتل کا منصوبہ بنا لیا۔ لڑکے کو مقررہ جگہ پر بلایا، وہاں اپنے دوست کو بھیجا، جس نے اپنے ایک اور دوست کی مدد سے ڈکیتی کی واردات کا رنگ دے کر جان سے مار دیا۔

کچھ سال پہلے ایک ایسا ہی واقعہ لیاری میں بھی ہوا تھا، جب پاکستان دہشت گردی کے خلاف جنگ لڑ رہا تھا۔ ایک گھر سے بم بھٹنے کی آواز آئی۔ وہ دو کمروں پر مشتمل چھوٹا سا گھر تھا۔ دھماکے کی آواز بہت خطرناک تھی، اور اندر سے کسی مرد کے چلانے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ ان دنوں دہشت گردی اپنے عروج پر تھی۔ لوگ ڈر گئے، اس لیے پولیس اور حساس اداروں کے آنے سے پہلے کوئی اندر نہیں گیا۔ پولیس کو اندر سے ایک آدمی زخمی حالت میں ملا۔ ابتدائی طور پر یہی پتہ چلا کہ گھر کے اندر دھماکہ خیز مواد موجود تھا، جس کے پھٹنے سے دھماکا ہوا۔ وہ گھر سیل کر دیا گیا اور کچھ دنوں کے بعد معاملے کی اصل حقیقت سامنے آئی، جس نے سب کو چونکا دیا۔ اس گھر میں فضل نامی آدمی رہتا تھا، جس کی دو سال پہلے اس کی والدہ نے شادی کروائی۔ جس سے شادی ہوئی وہ گھروں میں کام کرتی تھی۔ شروع میں سب ٹھیک چلا، لیکن پھر اس کی بیوی کو پتہ چلا کہ وہ نشہ کرتا ہے اور کام کاج بھی کوئی نہیں کرتا۔ اس لڑکی نے ساس کے ذریعے اس کو سمجھایا کہ وہ ایسے ناکارہ رہے گا تو گھر کیسے چلے گا، مگر فضل نے ایک نہ سنی۔ لڑائی جھگڑے اب اس گھر کا معمول تھے اور اچانک فضل کی ماں کی انتقال ہو گیا۔ مزید کچھ وقت گزرا مگر فضل میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ تنگ آ کر اس کی بیوی اپنے میکے چلی گئی، طلاق کا مطالبہ کر دیا اور اس میں اس کے گھر والوں نے بھی ساتھ دیا۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص کے ساتھ کب تک گزارا کرتی۔ اب تک کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ فضل نے طلاق دینے سے منع کیا تو اس نے خلع لے لی، اور اپنی زندگی کو پھر سے شروع کر دیا۔

کچھ مہینوں بعد اس کے گھر والوں نے اس کی دوسری شادی کر دی، جہاں وہ بہت خوش تھی۔ فضل کو اس کی شادی کا پتہ چلا تو وہ بدلے کی آگ میں جلنے لگا۔ اس نے اپنے آوارہ دوستوں کی مدد سے دستی بم بنانے کا سامان لیا اور گھر میں ہی بم بنانے لگا۔ اس بم کو وہ اپنی سابقہ بیوی کیلئے بنا رہا تھا، اس بم کے ذریعے وہ اس کو تڑپا کر مارنا چاہتا تھا، مگر قدرت نے اس کے ناپاک ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا اور بم بنانے کے آخری مراحل کے دوران ہی پھٹ گیا۔ جس میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو گئیں، اور کچھ عرصے بعد وہ خود بھی اپنی زندگی ہار گیا۔

ابھی کچھ دن پہلے ایک باپ نے اپنے بیٹے اور بہو کو غیرت کے نام پر جان سے مار دیا، جن کی دو مہینے پہلے ہی شادی ہوئی تھی۔ وجہ تھی ٹک ٹاک ویڈیو، جو اس کے بیٹے نے اپنی بیوی کے ساتھ بنائی اور وہ وائرل ہو گئی۔

اسی سال اگست میں لاہور میں ایک عورت کو اس کے سابقہ شوہر نے قتل کر دیا جب وہ اپنے آبائی گاؤں جا رہی تھی۔ کیونکہ اس نے دوسری شادی کر لی تھی اور بہت خوش بھی تھی۔ پولیس کی ابتدائی تفتیش کے مطابق اس قتل میں لڑکی کا باپ بھی شامل ہے۔ کیونکہ لڑکی کا پہلا شوہر اس کا کزن تھا، اس لیے اس کی طلاق سے اس کا باپ خوش نہیں تھا اور غیرت کے نام پر سابقہ داماد کے ساتھ مل کر بیٹی کو مروا دیا۔

رشتہ نہ دینے پر لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں۔ انہیں یہ اپنی توہین لگتی ہے اور بدلہ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہمیں انکار کیسے کر دیا۔ پاکستان میں عورتوں پر تیزاب پھینکنے کی سب سے بڑی وجہ رشتے سے انکار یا منگنی توڑ دینا ہے۔ اور انکار پاکستانی مرد سے برداشت نہیں ہوتا۔

ایک این جی او کے مطابق پاکستان میں 2007 سے 2018 تک عورتوں پر تیزاب پھینکنے کے 1485 واقعات رپورٹ ہوئے۔ دہشت گردی کیلئے قائم کی گئی خاص عدالتوں میں ایسے مجرموں کے خلاف کارروائی کا باقاعدہ آغاز 2012 سے کیا گیا، جو کہ مجرم کو سزا دلوانے کے عمل کو تیز کرتا ہے اور اس کی وجہ سے ایسڈ حملوں میں 2016 سے 2018 تک نصف کمی دیکھی گئی جو کہ حکومت کی کامیابی ہے۔

آپ نے بھی ایسے کئی واقعات کے بارے میں اخبارات، سوشل میڈیا کے ذریعے سے پڑھا ہوگا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ان واقعات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے جو کہ بہت خطرناک ہے۔ آپ نے جب شادی رضامندی سے کی، یا والدین کی مرضی سے کی، دونوں ہی صورتوں میں یہ آپ کا ایک نجی فیصلہ ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ رشتہ نہیں چل پاتا تو دونوں کو ہی ہلکی خوشی اس رشتے سے نکل جانا چاہیے۔ ایک دوسرے کی زندگی کو جہنم نہ بنائیے۔ طلاق کا مطلب ہی یہی ہے کہ اب آپ کا اس شخص سے اب کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کسی وجہ سے لڑکا، لڑکی جو کہ شادی کرنا چاہیں، لیکن نہ ہو پائے تو اسے انا کا مسئلہ نہ بنائیے، بلکہ اپنی نئی زندگی کی شروعات کیجئے اور دوسرے کو بھی کرنے دیجئے۔

لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں بڑھتی ہوئی عدم برداشت جہاں بہت سے مسائل پیدا کر رہی ہے، ان میں سے ایک بدلے کی آگ بھی ہے، جس میں ہمارا پورا معاشرہ سلگ رہا ہے۔ یہ کون سا بدلہ ہے جو دوسرے کی جان لینے سے کم ہوتا ہے۔ وہ زندگی جو اللہ نے عنایت کی، جس پر آپ کا کوئی حق نہیں ہے۔ حکومت کی جہاں ذمے داری ہے کہ ایسے دماغی مجرموں کو سخت اور فوری سزائیں دی جائیں، وہیں یہ ہماری معاشرتی ذمے داری بھی ہے کہ اپنے بچوں کو شخصی آزادی کا احترام کرنا سکھائیں۔ آخر کب تک یہ غیرت کے نام پر خون کی ندیاں بہاتے رہیں گے۔

عورت کے بارے میں ہماری نفسیاتی گرہیں کب کھلیں گی؟

پدرسری معاشرے کا مرد دوسرے مرد کو گالی بھی بکتا ہے تو مشق ستم عورت ہی ٹھہرتی ہے

ریپ کی ایک شکل ہمارے سامنے ہے اور پورا سماج اس پر سراپا احتجاج ہے۔ ہم اگر یہ چاہتے ہیں کہ یہ دکھ کسی اصلاح احوال کا نقش اول بن جائے تو ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہوگا کہ عورت کے بارے میں جن گرہوں کے ہم اسیر ہیں وہ گرہیں کب کھلیں گی؟

پہلے یہ جان لیجیے کہ تعزیرات پاکستان میں ریپ کا مفہوم کیا ہے۔

تعزیرات پاکستان کی دفعہ 375 کے تحت کسی خاتون سے جسمانی تعلق کی پانچ صورتوں کو ریپ کہا جائے گا۔

یہ تعلق اس عورت کی مرضی کے خلاف قائم کیا گیا ہو۔

یہ تعلق اس کی مرضی کے بغیر قائم کیا گیا ہو۔ (پہلی صورت میں willher Against اور دوسری صورت میں consentherWithout کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں)۔

اس تعلق میں عورت کی رضامندی تو شامل ہو لیکن یہ رضامندی اس عورت کو موت یا جسمانی نقصان کے خطرے میں ڈال کر لی گئی ہو۔

یہ تعلق اس غلط فہمی کی بنیاد پر قائم ہوا ہو کہ عورت نے مرد کو اپنا خاوند سمجھا ہو اور مرد جانتا ہو وہ اس کا خاوند نہیں۔

یہ تعلق کسی ایسی لڑکی کے ساتھ قائم کیا گیا ہو جس کی عمر 16 سال سے کم ہو، چاہے اس میں اس لڑکی کی رضامندی شامل ہو یا نہ ہو۔

اب اپنے معاشرے پر ایک نگاہ دوڑائیے۔ ہمارے ہاں دانشوری کا عمومی میدان چونکہ سیاست قرار پایا ہے اس لیے سماجیات کے باب میں بے گانگی اور بے نیازی ہے۔ سماجیات البتہ جن کا موضوع ہے وہ جانتے ہیں کہ جبری شادیوں کے سماجی المیے نے کس طرح معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، اب ذرا ریپ کی تعریف کے پہلے دو اجزا پر ایک نظر ڈالیے اور بتایئے جبری شادی کو شادی کہا جائے گا یا ریپ؟

ہمارے ہاں دانشوری کا عمومی میدان چونکہ سیاست قرار پایا ہے اس لیے سماجیات کے باب میں بے گانگی اور بے نیازی ہے۔ سماجیات البتہ جن کا موضوع ہے وہ جانتے ہیں کہ جبری شادیوں کے سماجی المیے نے کس طرح معاشرے کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، اب ذرا ریپ کی تعریف کے پہلے دو اجزا پر ایک نظر ڈالیے اور بتایئے جبری شادی کو شادی کہا جائے گا یا ریپ؟

پہلے دو اجزا پر ایک نظر ڈالیے اور بتایئے جبری شادی کو شادی کہا جائے گا یا ریپ؟

اب سوال یہ ہے ایک مقدس معاہدے میں ایک فریق کی مرضی ہی شامل نہ ہو، اسے محض برادری میں رشتہ کرنے اور جائیداد کو غیروں میں جانے سے روکنے کے لیے کسی ایسے فرد سے بیاہ دیا جائے جو اسے پسند ہی نہ ہو اور وہ اس سے نفرت کرتی ہو یا اس کے بھائی جان کسی کو قتل کر آئے ہوں اور بدلے صلح میں مقتول کے کسی عزیز سے اب اپنی بہن کو بیاہ رہے ہوں تاکہ وہ سزا سے بچ سکیں یا وہ نہ سہ میں کسی ناپسندیدہ آدمی سے اس کی شادی کرائی جا رہی ہو تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نکاح کی کیا حیثیت ہے؟ ایسے نکاحوں کے بارے میں ہمارے ہاں حساسیت کیوں پیدا نہیں ہو سکی اور ہم نے ریپ کی ان شکلوں کو رواج کا درجہ کیوں دے رکھا ہے؟

پاکستان کا قانون یہ کہتا ہے کہ 16 سال سے کم عمر کی لڑکی سے جسمانی تعلق ریپ کہلائے گا اور اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو گی کہ اس میں اس کی رضامندی شامل ہے یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ 16 سال سے کم عمر کی لڑکی کی نکاح کے بارے میں سماج کا رویہ کیا ہے اور اس کی حساسیت کا عالم کیا ہے؟

نکاح اگر ایک معاہدہ ہے اور مقدس معاہدہ تو ایک نابالغ بچی اس معاہدے کی فریق کیسے بن سکتی ہے؟ معاہدہ وہ کر سکتا ہے جو بالغ ہو۔ جو بالغ ہی نہیں اور قانونی اعتبار سے معاہدہ کرنے کے قابل ہی نہیں اسے نکاح کے معاہدے کا پابند کیسے کیا جا سکتا ہے؟ نابالغ بچی نہ معاہدہ کرنے کے قابل ہے اور نہ اس قابل ہے کہ وظیفہ زوجیت ادا کر سکے۔ لیکن آئے روز ہم خبریں پڑھتے ہیں فلاں شہر میں ایسا نکاح ہو گیا اور پولیس نے نکاح خواں سمیت دلہا اور دیگر کو گرفتار کر لیا۔ سماج نے کبھی اس پر حساسیت نہیں دکھائی۔

قوانین تو موجود ہیں لیکن سماج کی گرہیں کیسے کھلیں گی؟ میاں بیوی کا تعلق ہی محبت کا تعلق ہے لیکن یہاں باہم انڈر سٹینڈنگ ہو تو سماج کے نزدیک وہ مرد 'رن مرید' قرار پاتا ہے۔ اخلاقیات کے سارے تصورات ہم نے لڑکیوں کے لیے رکھ چھوڑے ہیں اور ہم بھول گئے ہیں کہ مرد کو بھی نگاہ نیچی رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پدرسری معاشرے کا مرد دوسرے مرد کو گالی بھی بکتا ہے تو مشق ستم عورت ہی ٹھہرتی ہے۔ گالی ماں بہن کی دی جاتی ہے اور بے تکلف دوستوں میں تو اسے ایک رواج کا درجہ حاصل ہے، روایتی گھرانوں میں بھی لڑکے کے سامنے درجنوں لڑکیوں کی تصاویر رکھ کر اس کی پسند معلوم کی جاتی ہے لیکن لڑکی اگر اپنی پسند زبان پر لے آئے تو اس کی یہ جسارت قابل برداشت نہیں۔

قانون کا تعلق استثنائی صورت حال سے ہوتا ہے لیکن تربیت ایک ہمہ جہت اور مسلسل عمل کا نام ہے۔ ایک حادثہ ہوا اور اس نے سماج کو ہلا کر رکھ دیا۔ لازم ہے کہ قانون اپنا راستہ بنائے اور مجرم کو قرار واقعی سزا ملے۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہونی چاہیے۔ جس دکھ نے ہمیں گرفت میں لے رکھا ہے وہ اصلاح احوال میں تب ہی ڈھل پائے گا جب اسی یکسوئی کے ساتھ سماج کی تربیت کو بھی موضوع بنایا جائے گا۔

کیا ہم یہ بھاری پتھر اٹھائیں گے؟

معاشی انصاف نہ ہو تو جرائم جنم لیتے ہیں

سائرہ نکویر

معاشی انصاف سے مراد معاشرے میں موجود تمام افراد کے لئے ایسے مواقع اور حالات پیدا کرنا ہے جس کے ذریعے وہ نہ صرف اپنی تمام بنیادی ضروریات باعزت طور پر پوری کر سکیں بلکہ اپنے رجحان کے مطابق تخلیقی اور بامقصد زندگی بسر کر سکیں۔ معاشی انصاف دراصل سماجی انصاف ہی کی ایک کڑی ہے۔ تمام انسانوں کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتیں یکساں نہیں ہوتیں اور ہر انسان کا ماحول اور وراثت میں ملنے والی خصوصیات بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اس لیے انفرادی کوشش اور محنت سے حاصل کردہ نتائج بھی یکساں نہیں ہو سکتے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہ نہیں کہ چند لوگ تو عیش و آرام کی زندگی بسر کریں اور دیگر تمام لوگ دکھ اور تکلیف میں مبتلا رہیں۔

محنت اور بدلے کے درمیان توازن قائم کرنا انسانی فطرت کے عین مطابق ہے، اس سے نفسِ انسانی میں راسخ میلانات کے تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں، مزید برآں اس سے انسان میں آزادی اور عزتِ نفس پیدا ہوتی ہے، شخصیت میں وقار پیدا ہوتا ہے، معاشی انصاف معاشرے میں امن کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ معاشرے میں بھائی چارے کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک انصاف نہ ہو۔ معاشی انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے تمام وسائل تمام انسانوں کی بھلائی کے لیے خرچ ہونے چاہئیں، بنیادی ضروریات کی فراہمی افراد کی محنت سے منسلک ہونی چاہئے، البتہ بوڑھے اور معذور لوگوں کی ضروریات کو پورا کرنا حکومتِ وقت کی ذمہ داری ہے۔

محنت و جدوجہد اور آگے بڑھنے کی لگن کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے جہاں انفرادی ملکیت رکھنے کی اجازت دی جانی چاہیے وہیں ایسے ذرائع جن پر عوامی بہبود کا انحصار ہو ان کی ملکیت بھی چند افراد کے ہاتھوں میں جانے سے روکنے کیلئے بھی مؤثر قوانین کے اجرا کی ضرورت ہے۔

اگرچہ ہر انسان اپنی صلاحیت کے مطابق دولت کمانے اور رکھنے کا مجاز ہے مگر اہم ہے کہ دولت بامقصد کاموں میں خرچ کی جائے، محض نمود و نمائش کی خاطر روپے کا استعمال ایک ناپسندیدہ عمل ہے۔ اس کے معاشرتی سطح پر منفی اثرات رونما ہوتے ہیں۔ مثلاً شادی بیاہ پر امرا کی جانب سے دولت کی نمائش سے غربا احساسِ کمتری کے بوجھ تلے دب جاتے ہیں، پورے معاشرے پر اس طرح سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں کہ اکثر لوگوں کے لیے اپنی بیٹیوں کی شادی کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا ایک مشکل کام بن جاتا ہے۔

اس ضمن میں ایک اضافی بات جو مشاہدے میں آتی ہے کہ آجکل موبائل فون پر مختلف قسم کی لغو کھیلیں کھیلی جاتی ہیں جن پر کثر لوگ اپنا قیمتی وقت اور پیسہ ضائع کرتے ہیں بلکہ بچوں کو ایکس باکس اور پلے سٹیشن جیسے مہنگے آلات بھی خرید کر دیتے ہیں، یہ اشیا بھی بچوں کی سطح پر مقابلہ بازی جنم دیتی ہے۔ اس طرح کی کئی ایک مثالیں ہیں جو معاشرے میں آگے چل کر تفریق پیدا کرتی ہے۔ یوں بچے جسمانی ورزش سے دور ہو جاتے ہیں بلکہ ان میں ایک دوسرے سے ملنے جلنے کی عادت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پس خدا کی عطا کردہ تمام نعمتیں تمام انسانوں کے لئے مسخر کی گئی ہیں، چند افراد کو ان پر قابض ہو کر باقیوں کو ان سے محروم کرنے کا حق حاصل نہیں، ورنہ معاشرہ جرائم جنم دیتا ہے اور شکست و ریخت کے شکار معاشرے دیگر قوموں کے مقابلے میں اپنا وقار اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ اپنا وجود تک کھو دیتے ہیں۔

ٹریفک میں نظم وضبط کا فقدان اور حادثات

ٹریفک قوانین کی قانون شکنی سے منفی رویے جنم لے رہے ہیں

سعدیہ اسلم

اگر لفظ ''نظم وضبط'' پر غور کیا جائے تو اس کی اہمیت ہمیں اپنے چاروں طرف معلوم ہوگی۔ نظم وضبط ایک سلسلہ اور ترتیب کا نام ہے جو معاشرے کے نظام کو منظم اور مضبوط کرتا ہے اور جس معاشرے میں نظم وضبط کا وجود نہیں ہوگا وہاں افراتفری اور منفی نتائج نظر آئیں گے۔ یہ لفظ اپنے آپ میں بہت سی خوبیاں پروئے ہوئے ہے۔ عملی زندگی میں نظم و ضبط کی ایک مثال پاکستان کی سڑکوں پر دیکھیں تو حالات یکسر مختلف ہوں گے کیونکہ نظم وضبط کی غیر موجودگی حادثات کے بڑھنے کا باعث بن رہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آخر ہمیں سڑکوں پر نظم وضبط کی ضرورت ہی کیوں ہے؟ کیا آپ نے کبھی سوچا ہوگا کہ ایسے کون سے عوامل ہیں جو سڑکوں پر نظم وضبط کو قائم رکھ سکتے ہیں؟ پاکستان کی سڑکوں پر موجود مختلف رنگ وڈیزائن کی نئی لائنوں کے بارے میں بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہوگا۔ ہم اکثر روزانہ کام کے سلسلے کیلئے سڑکوں پر سفر کرتے ہیں اور مختلف رنگ وڈیزائن کی لائنوں کو دیکھتے ہیں۔ اکثر افراد کے ذہن میں یہ بات آتی ہوگی کہ ان کا کوئی مقصد نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔ حالانکہ یہ مختلف لائنیں سڑکوں پر نظم وضبط پیدا کرنے کا سبب ہیں۔ سڑکوں پر موجود مختلف رنگ وڈیزائن کی لائنوں کا مطلب جاننا بہت ضروری ہو چکا ہے اور کیسے ڈرائیور حضرات نظم وضبط پر قائم رہ کر حادثات سے بچ سکتے ہیں۔

سب سے پہلے اکثر شاہراہوں کے کناروں پر ''ایک لمبی زرد لائن'' بنی ہوتی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پارکنگ کی اجازت ہرگز نہیں ہے۔ اگر سڑک پر ''تقسیم شدہ سفید لائن'' موجود ہے تو عموماً یہ سڑک مرکزی شاہراہ سے ذیلی سڑک میں تبدیل ہو جاتی ہے جبکہ غور کیا جائے تو آپ کو ان سڑکوں پر بہت کم ٹریفک ملے گی۔ اس لائن کا مطلب یہ ہے کہ آپ آرام سے ایک لائن سے دوسری لائن میں منتقل ہو سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

اگر آپ سڑک پر ''لمبی سفید لائن'' دیکھیں تو یہ ذیلی سڑک سے مرکزی شاہراہ کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ جبکہ اس لائن سے مراد یہ ہے کہ آپ ایک لائن سے دوسری لائن پر منتقل نہیں ہو سکتے، اس پر آپ کو پابندی ہے۔ کیونکہ مرکزی شاہراہ پر ٹریفک معمول سے زیادہ ہوتی ہے، یک دم اوورٹیکنگ حادثات کو جنم دے سکتی ہے۔ آپ کو لائن میں اس وقت تک رہنا ہوگا جب تک ایک لائن دوسری لائن میں تبدیل نہ ہو جائے۔ سڑکوں پر ''تقسیم شدہ زرد لائن'' سے مراد یہ ہے ڈرائیور دوران ڈرائیو رنگ اپنی آگے والی گاڑی کو آرام سے اوورٹیک کر سکتا ہے، لیکن اس کے لیے احتیاط لازمی ہے۔ اوورٹیک کرنے سے پہلے اگلی یا پچھلی گاڑی کو اشارہ دینا بہت ضروری ہوتا ہے۔

سڑک پر ''دو انتظامی زرد لائنیں'' جب موجود ہوں تو اس سے مراد یہ ہے کہ ڈرائیور اپنی لائن میں رہ کر ہی ڈرائیونگ کریں، بلاوجہ اوورٹیکنگ کرنے پر پابندی ہے۔ کیونکہ یہ خطرناک عمل ہے۔ اس کے علاوہ ''ایک تقسیم شدہ اور ایک زرد لائن'' سے مراد یہ ہے کہ ڈرائیور ڈرائیونگ کے دوران دوسری گاڑی کو اوورٹیک کر سکتا ہے۔ ایسا عمل ذیلی سڑکوں پر ممکن ہے جبکہ مرکزی شاہراہ پر یہ عمل خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ جبکہ ''تقسیم شدہ زرد لائن'' سے مراد یہ ہے کہ ڈرائیور غیر معمولی احتیاط کے ساتھ اپنی اگلی گاڑی کو اوورٹیک کر سکتا ہے۔

سڑکوں پر موجود یہ رنگ و ڈیزائن حفاظت کیلئے بنائے گئے ہیں تاکہ حادثات کم سے کم ہو سکیں لیکن پاکستان میں ڈرائیور حضرات کو سڑکوں پر موجود ان لائنوں کا مطلب معلوم ہی نہیں ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہاں ڈرائیورز قانون شکنی کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کرتے بلکہ اپنے ساتھ دوسروں کا بھی نقصان کروا لیتے ہیں، جبکہ ازالہ ناممکن ہے۔

اس کے علاوہ دوسرا نقطہ جو انتہائی اہم ہے وہ ڈرائیوروں کو معلوم ہی نہیں کہ انہیں کون سی لائن میں رہ کر ڈرائیونگ کرنی چاہیے۔ جیسے کہ عام طور پر سڑکوں پر دو یا تین لائنیں ہوتی ہیں، فرض کیا جائے کہ اگر سڑک پر تین لائنیں موجود ہیں تو وہ گاڑیاں جو دائیں طرف مڑنا چاہتی ہیں ان کو دائیں لائن پر ہونا چاہیے، جبکہ سیدھے راستے پر جانے والوں کو درمیان میں ہونا چاہیے، بائیں جانب مڑنے والوں کو ہمیشہ بائیں لائن پر ہونا چاہیے۔ تاہم، بسیں ہمیشہ بائیں لائن پر ہونی چاہئیں کیونکہ بس اسٹاپ سڑک کے بائیں جانب ہی واقع ہوتے ہیں۔

مرکزی شاہراہوں پر رفتار کے لحاظ سے وہ گاڑیاں جو آہستہ چلتی ہیں، جیسے کہ ٹرک، انہیں سڑک کے بائیں جانب ہونا چاہیے جبکہ تیز رفتار گاڑیوں کو سڑک کے دائیں جانب ہونا چاہیے۔ اوورٹیک کرتے وقت لائن میں تبدیلی کی اجازت ہے۔ آہستہ چلنے والی گاڑیوں کو اوورٹیک کرنے کے بعد واپس بائیں لین میں آنا ہوگا۔ تاہم عام طور پر مرکزی شاہراہوں پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ ٹرک دائیں لین پر آہستہ آہستہ گاڑی چلاتے ہیں اور دوسرے ڈرائیوروں کو بائیں جانب سے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں، جبکہ آہستہ چلنے والی گاڑیاں ٹریفک کی رفتار کو کم کرتی ہیں۔

ٹریفک قوانین کی قانون شکنی سے منفی رویے جنم لے رہے ہیں اور یہ منفی رویہ جات سڑکوں پر حادثات کو دن بدن بڑھا رہے ہیں۔ کیونکہ جب نظم وضبط کی پاسداری نہ ہو تو معاشرے میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ سڑکوں پر نظم وضبط کی صورت حال پیدا کرنے کیلئے عوام میں شعور بیدار کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک شعور بیدار نہ کیا گیا تب تک حادثات کی شرح میں کمی ناممکن ہے۔

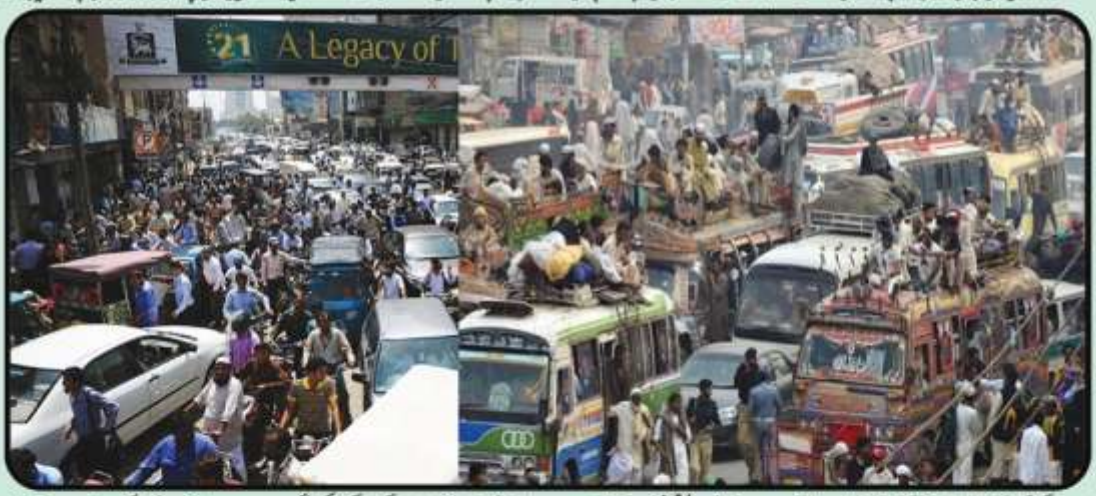

نئے کورونا وائرس سے ہونے والی بیماری کووڈ19 صرف معمر افراد کو ہی زیادہ متاثر نہیں کرتی بلکہ یہ نوجوانوں کو بھی بہت زیادہ نقصان پہنچا سکتی ہے۔

اس حوالے سے روزانہ ہی مختلف کہانیاں سامنے آتی ہیں، ایسی ہی ایک چونکا دینے والی داستان امریکا سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون نے بیان کی ہے۔

ٹیکساس سے تعلق رکھنے والی 24 سالہ خاتون پاؤلا کاسٹیلو کو 27 اپریل کو کورونا وائرس کی علامات جیسے کھانسی، سانس لینے میں مشکلات اور بخار کے ساتھ ہسپتال کے ایمرجنسی روم میں داخل کیا گیا تھا۔

اس وقت خاتون کا خیال تھا کہ یہ بیماری اسے متاثر نہیں کرسکتی اور اسی وجہ سے وہ احتیاطی تدابیر جیسے فیس ماسک کے استعمال سے دور تھی۔

سی بی ایس سے بات کرتے پاؤلا نے بتایا 'میں ہمیشہ لوگوں کے ارگرد رہتی تھی مگر میرا خیال تھا کہ میں ٹھیک ہوں، مجھے نہیں لگتا تھا کہ میں اس کا شکار ہوسکتی ہوں'۔

مگر 79 دن ہسپتال میں گزارنے کے بعد جہاں وہ موت کے منہ میں پہنچ گئی تھی، پاؤلا کا سٹیلو کو لگتا ہے کہ اس نے جان لیوا غلطی کی تھی۔

انہوں نے کہا 'شاید اگر میں نے ماہرین کی بات سن کر فیس ماسک کو پہن لیا ہوتا، تو میں ان سب سے بچ جاتی'۔

اس خاتون کو 15 جولائی کو ہسپتال سے خارج کیا گیا، جس کے دوران ایک مہینے سے زیادہ وقت آئی سی یو، وینٹی لیٹر اور سکون آور ادویات کو استعمال کرتے ہوئے گزارا۔ وینٹی لیٹر سے نکالے جانے کے بعد بھی ہسپتال میں بحالی نو کی تھراپی کے ذریعے روزمرہ کے عام کام جیسے چلنا، بات کرنا اور نگلنے کو سیکھا۔

اگرچہ مکمل بحالی کے عمل میں ابھی کافی وقت لگ سکتا ہے مگر ہسپتال کے گھنٹے نے خاتون کی ہمت کو سراہا۔

متعدد افراد کورونا وائرس کو زیادہ سنجیدہ نہیں لیتے اور اس بیماری کے نتیجے میں ہلاک ہوجاتے ہیں اور کچھ نے تو بستر مرگ پر پچھتاوے کا اظہار بھی کیا۔

ٹیکساس سے ہی تعلق رکھنے والے 30 سالہ شخص ایک کووڈ19 پارٹی میں شرکت کے بعد چل بسا اور موت سے چند لمحات قبل اس نے نرس کو کہا تھا 'میرے خیال میں مجھ سے غلطی ہوئی، میں نے سوچا کہ یہ ایک افواہ ہے، مگر ایسا نہیں تھا'۔

کیلیفورنیا سے تعلق رکھنے والے 51 سالہ ایک شخص نے جون کے آغاز میں ایک دعوت میں شرکت کی اور 20 جون کو وینٹی لیٹر پر جانے کے بعد چل بسا۔

اس نے بھی موت سے پہلے فیس بک پر پچھتاوے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا 'میری حماقت کی وجہ سے میں نے اپنی ماں، بہنوں اور خاندان کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا، یہ ایک بہت تکلیف دہ تجربہ تھا'۔

کچھ متاثرہ افراد کے خاندانوں نے احتیاطی تدابیر جیسے فیس ماسک کو پہننے کی اہمیت پر بات کی۔

مثال کے طور پر ایریزونا سے تعلق رکھنے والا ایک

شخص 30 جون کو چل بسا اور اس کی بیٹی نے اس کی وجہ مقامی اور وفاقی سیاستدانوں کی جانب سے ریاست کو جلد کھولنا قرار دیا۔

14 جولائی کو امریکا کے ادارے سی ڈی سی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر رابرٹ ریڈفیلڈ نے ہر ایک کے لیے فیس ماسک کے استعمال کا مطالبہ کیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ ڈیٹا سے واضح ہے کہ فیس ماسک کا استعمال بچاؤ کا موثر طریقہ ہے، اگر ہر ایک ابھی ماسک پہننا شروع کردے تو میرے خیال میں کورونا وائرس کی وبا کو کنٹرول میں لاسکتے ہیں۔

فیس ماسک نہ پہننا مجھے موت کے منہ میں لے گیا!

مہنگائی، غربت، لاقانونیت اور جمہوریت

میمونہ حسین

چند روز قبل رات کے پچھلے پہر میرا گزر ایک پرانے محلے سے ہوا جس کے مکانات کی باہم ملی ہوئی دیواریں کو زیادہ اونچی نہ ہونے کے باعث پھلانگنا نہایت آسان تھا۔ اس وقت گلی میں روشنی بھی نہ ہونے کے برابر تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ کسی آتے جاتے شخص کو باآسانی دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے ایک شخص کو گھر کی دیوار پھلانگ کر باہر آتے ہوئے دیکھا۔ اچانک ہی ''چور چور'' کا شور سنائی دیا اور گلی میں لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا۔ دیوار پھلانگنے والا شخص جو واقعتاً چور ہی تھا، وہ بھی نہایت چالاکی سے ہجوم میں جا گھسا اور باقی لوگوں کے ساتھ چور، چور پکارنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شور سن کر سارا محلہ تو بیدار ہوگیا مگر چور نہایت چالاکی سے چور چور کی صدائیں لگاتا ہوا باآسانی وہاں سے نکل گیا۔ محلے کے سارے لوگ مایوس ہوکر اپنے اپنے گھروں میں چلے گئے۔

پچھلے 72 سال سے ہمارے عوام بھی یونہی مایوس ہوکر، سر پکڑ کر خاموش ہوجاتے ہیں۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس سے قبل چور، چور کی صدا سے پہلے بھی ایک صدا بلند ہوئی تھی روٹی، کپڑا اور مکان۔ عوام تب بھی اس صدا کے پیچھے چل پڑے تھے اور آج عوام پھر چور، چور کی صدا پر چل پڑے۔ نہ عوام کو تب کچھ ملا تھا اور نہ ہی اب چور ملے گا۔ اب تو عوام سے یہ تینوں چیزیں روٹی، کپڑا اور مکان بھی چھن رہے ہیں۔ مگر یہ بات میں نہایت افسوس کے ساتھ کہہ رہی ہوں کہ ہمارے محترم وزیراعظم عمران خان، جن کو وزیراعظم بننے کی خواہش صرف اس لیے تھی کہ اس ملک سے غربت کا خاتمہ کرنا چاہتے تھے، پڑھے لکھے نوجوانوں کو نوکریاں دینا چاہتے تھے، وہ صرف پاکستانیوں کو ہی نہیں بلکہ پاکستان سے باہر کے لوگوں کو بھی نوکریاں دینا چاہتے تھے کہ پاکستان سے باہر کے لوگ یہاں نوکریاں تلاش کرنے آئیں گے۔ یہ خواب تو بہت خوبصورت تھا، لیکن تھا یہ خواب ہی جو 2 ہی سال میں ٹوٹ گیا۔

ان دو برسوں میں یوں لگا کہ ''غربت مکاؤ'' مہم سے زیادہ ''غریب مکاؤ'' مہم شروع ہوچکی ہے، کیونکہ پاکستان میں روزانہ کی بنیاد پر مہنگائی میں اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔ اب اس کا بھی حل ہمارے وزیراعظم نے آٹر نکال ہی لیا کہ مہنگائی کو کنٹرول کرنے کیلئے ان کی مدد تائیگر فورس کرے گی۔ وزیراعظم عمران خان کی اس بات پر میں ہنسوں یا روؤں کچھ سمجھ نہیں آرہا۔ ریاست اداروں کا مجموعہ ہوتی ہے اور سارے ادارے حکومت کے زیر ہوتے ہیں۔ جب کہ مہنگائی کنٹرول کرنے کیلئے نہ صرف حکومت بے بس نظر آرہی ہے بلکہ انہی کے ماتحت پرائس کنٹرول کمیٹی کے ممبران میں اتنی اہلیت ہی نہیں کہ وہ حکومت کو کوئی مشورہ دے سکیں کہ بڑھتی ہوئی قیمتوں کو کیسے کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں حد درجہ بڑھتی ہوئی مہنگائی نے نہ صرف عوام کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے بلکہ کاروبار پر بھی منفی اثرات نمایاں ہورہے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں اقتصادی ترقی کی شرح اس حکومت میں آدھی رہ گئی ہے، جس کی اہم وجہ اشیائے خوردونوش کی قیمتوں میں اضافہ ہے۔ حکومت کا شاید اس طرف دھیان نہیں یا وہ دھیان دینا نہیں چاہتے۔ کہ جو گیا وہ پی ٹی آئی کا پہلے 90 دن کا پلان؟ ہماری قوم کی یادداشت بہت کمزور ہے، جس کا یہ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

پاکستان ایک زرعی ملک ہے، باوجود اس کے کہ یہاں کاشتکاری پر توجہ دے کر چیزوں کو سستا کیا جاتا، مگر گندم کو دوسرے ممالک سے منگوایا جارہا ہے۔ جو گندم منگوائی گئی وہ کیڑا لگنے کی وجہ سے کراچی نے تو لینے سے انکار کردیا تھا مگر اس میں سے کچھ حصہ پنجاب میں بھیجا گیا۔ بجائے اس کے کہ جہاں سے گندم منگوائی گئی واپس بھیج کرتے یا انہیں واپس بھیجی جاتی، مگر بے حسی کی انتہا کہ باقی گندم سمندر برد کردی گئی۔ اس کارنامے کے بعد ان چند مہینوں میں ہماری مقامی گندم کی قیمت آسمان کو چھونے لگی اور گندم 2400 روپے من ملنے لگی۔ قیمتوں میں اضافے کی وجہ سے آٹے کی قیمت میں 18.5 فیصد اضافہ ہوا۔ مجھے تو یوں محسوس ہورہا ہے کہ اس ملک میں عزت سستی اور روٹی مہنگی ہونے جارہی ہے۔

میں یہاں زیادہ چیزوں کا ذکر نہیں کروں گی، صرف بنیادی اشیائے ضروریہ کی ہی بات کروں گی جو روزانہ کی بنیاد پر امیر کو بھی چاہیے اور غریب کو بھی۔ ان چند مہینوں میں سبزیاں 17 فیصد، گھی 22 فیصد، کوکنگ آئل 17 فیصد، چینی 45 روپے فی کلو سے مہنگی ہوکر سو روپے فی کلو ہوچکی ہے۔ پیاز 19.59 فیصد مہنگے ہوئے اور ٹماٹر تو 100 فیصد مہنگے ہوئے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جس کی ضرورت ہر طبقے کو ہوتی ہے، مگر میں یہاں واضح کرتی چلوں کہ ایک امیر طبقہ خوراک پر اپنی آمدنی کا 20 یا 30 فیصد حصہ خرچ کرتا ہے مگر ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا آدمی اپنی آمدنی کا 70 سے 80 فیصد تک خرچ کرتا ہے۔

اس ساری صورتحال میں اس وقت بھی حکومتی پالانگ کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ پاکستان کی موجودہ صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے تین طرح کے فوری اقدام کرنے چاہئیں۔ ایک یہ کہ حکومت کس طرح عام شہریوں کی اقتصادی قوت کو بڑھائے تاکہ عوام کے پاس مالی وسائل زیادہ ہوں۔

دوم پاکستان میں گھریلو صنعت کاری کو فروغ دیا جائے تاکہ فوری طور پر بے روزگاری کو قابو میں لایا جاسکے اور معیشت کو بھی تقویت ملے۔ سوم جو سب سے اہم اور بڑی وجہ شرح سود میں کمی لائی جاسکے۔ کیونکہ صنعتی طبقے پر قرضے اتنے زیادہ ہوگئے ہیں کہ کاروباری طبقہ اپنی فیکٹریاں بند کرنے پر مجبور ہے۔

مہنگائی کے اثرات نے جہاں صنعتوں پر منفی اثرات ڈالے ہیں، وہیں لاقانونیت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ جمہوریت کا حسن تو یہ ہے کہ وسائل کی تقسیم اوپر سے نیچے تک ہوتی ہے مگر پاکستان میں ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ غیر منصفانہ تقسیم کے باعث معاشرے میں غربت، بے چینی، مایوسی، افراتفری پھیلی ہے اور بے روزگاری کے باعث چوری، قتل، دھوکا دہی، ریپ کیسز اور دیگر جرائم میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اور ان سارے مسائل کی ایک ہی جڑ مہنگائی اور غربت ہے۔

آئی ٹی اور پاکستان

سالار سلیمان

دنیا میں کمپنیاں بنتی ہیں، کاروبار کرتی ہیں، نفع نقصان کا حساب ہوتا ہے اور پھر وہ ایک وقت کے بعد ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن کچھ کمپنیاں ایسی ہوتی ہیں جو دہائیوں سے کام کر رہی ہوتی ہیں۔ ان میں سے کچھ ایسی ہوتی ہیں جنہیں مارکیٹ میں نصف صدی سے زیادہ ہو چکا ہوتا ہے اور ایسی کمپنیاں جو اپنے کاروباری دورانیے کے سو سال مکمل کر چکی ہوتی ہیں، وہ بہت کم ہوتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ اندرون لاہور کھانے پینے، چمڑہ رنگنے، لوہے سمیت ایسے کئی کاروبار آپ کو مل جائیں گے جو کم از کم 80 سال پرانے ہیں لیکن وہ گمنام بھی ہیں اور انہیں اتنے عرصے بعد منافع کی جس سطح پر ہونا چاہیے، یہ اس کے آس پاس بھی نہیں ہیں؟ یہ وجہ سوچ کا فرق، ترقی کی خواہش کی عدم موجودگی ہے۔

دنیا گزشتہ دہائی میں بہت تیزی سے آئی ٹی کے بزنس کی جانب جا چکی ہے۔ لیپ ٹاپ اور موبائل فون کسی وقت میں لگژری سمجھا جاتا تھا، یہ آج ضرورت ہے۔ ان کے بغیر زندگی گزارنا ایک مشکل کام ہے اور جیسے جیسے دنیا ڈیجیٹل اور اسمارٹ ہوتی جا رہی ہے، ویسے ویسے ان کی اہمیت ہماری زندگی میں بڑھتی جا رہی ہے۔ فیس بک اور ٹویٹر آپ کے قومی شناختی کارڈ کے بعد دوسری شناخت ہیں۔ پاکستان میں ایسی کئی کمپنیاں موجود ہیں جنہوں نے گوگل اور فیس بک کا درست استعمال کیا اور آج وہ کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپے کا کاروبار کر رہی ہیں۔

دنیا میں ایسی کمپنیاں بھی موجود ہیں جنہوں نے مارکیٹ کے بدلتے ہوئے ٹرینڈز کا صحیح اندازہ نہیں کیا اور پھر وہ ختم ہو گئیں یا بزنس میں بہت پیچھے چلی گئیں۔ میری خواہش ہے کہ پاکستان بھر کے بزنس اسکولز میں یاہو، ایچ ٹی سی، بلیک بیری، نوکیا، گوگل پلس، گوگل آرکٹ، مائی اسپیس کو بطور کیس اسٹڈی پڑھایا جائے اور دوسری جانب ٹویٹر، فیس بک، ایمازون، بیدو وغیرہ کو بھی بطور کیس اسٹڈی پڑھایا جائے۔

سافٹ ویئر اور آئی ٹی کے کاروبار کا مستقبل کیا ہے۔ اس بات کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ہمارے

دونوں ہمسائے جس شعبے پر سب سے زیادہ توجہ دے رہے ہیں وہ آئی ٹی ہے۔ ڈیجیٹل انڈیا کی مہم تو ابھی چند سال قبل کی بات ہے۔ 2019 میں بھارت کا آئی ٹی سیکٹر سے ریونیو 130 ارب ڈالر تھا۔ دنیا جہاں کی آئی ٹی کمپنیاں بھارت میں موجود ہیں۔ دنیا بھر کے ٹاپ سی ای اوز بھارتی نژاد ہیں۔ نامور اسٹور وال مارٹ نے فلپ کارٹ کے ساتھ بھارت سے 2019 میں 6 ارب ڈالر سے زائد کمائے تھے۔ یہ اتنی رقم ہے جتنی پاکستان کو 2018 میں آئی ایم ایف سے بیل آؤٹ کی مد میں چاہیے تھی۔ بھارت میں ہی ریل گاڑی کی ٹکٹ بکنگ سروس کی ویب سائٹ نے 2019 میں 38 ملین ڈالر سے زائد کا ریونیو کمایا تھا۔

چین کی جانب دیکھیے۔ 2018 میں چین کا آئی ٹی سے ریونیو 118 ارب ڈالر تھا۔ 2020 کی پہلی ششماہی میں چین کی سافٹ ویئر انڈسٹری 3.56 ٹریلین یوان یعنی 508 ارب ڈالر تک جا پہنچی ہے۔ یہ گزشتہ سال کی نسبت 6.7 فیصد کا اضافہ ہے جبکہ متعلقہ دورانیے کا 12.9 فیصد اضافہ بنتا ہے۔ چین نے گوگل کے مقابلے میں اپنا سرچ انجن بیدو بنایا۔ اس کمپنی نے 2019 میں 15 ہزار ملین ڈالر سے زائد کا ریونیو کمایا تھا۔ علی بابا نے 2019 میں 23 ہزار ملین ڈالر جبکہ ہواوے نے 121 ارب ڈالر سے زائد کمائے تھے۔

دوسری جانب ہماری حالت دیکھیے۔ ہم ابھی خواب سے جاگے ہیں، اب ہم انگڑائی لیں گے اور پھر دوڑ میں حصہ لیں گے۔ جبکہ دنیا اس دوڑ میں ہمیں کافی پیچھے چھوڑ چکی ہوگی۔ پاکستان جس اسپیس پروگرام پر اب کام شروع کر رہا ہے، دنیا اس سے اگلی ٹیکنالوجی پر کام شروع کر چکی ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا سے 50 سے 70 سال پیچھے چل رہے ہیں جبکہ ہمارے ہمسائے تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔

پاکستانی معیشت کی کل مالیت تقریباً 284 ارب ڈالر ہے۔ 2017 تا 2018 میں ہماری شرح 5.5 فیصد تھی، جو کم ہو کر 2018 تا 2019 میں 1.9 فیصد ہوئی اور اس سال منفی میں ہوگی، جس کا اندازہ منفی 2.6 فیصد ہے۔ پاکستان نے 2018 تا 2019 میں صرف 540 ملین ڈالر کا آئی ٹی کا کام کیا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم صلاحیت ہونے کے باوجود بھی اتنا پیچھے ہیں؟ یہ سالانہ صرف 3.8 فیصد کی بڑھوتری ہے، جسے کم از کم 16 فیصد تک ہونا چاہیے تھا۔ کیوں ہماری سافٹ ویئر ایکسپورٹ صرف ایک ارب ڈالر تک ہے جبکہ ہم میں صلاحیت 6 ارب ڈالر کی ہے؟ کیا وجہ ہے کہ حکومت سمیت وہ سب ادارے جو کچھ کر سکتے ہیں، وہ یہاں توجہ ہی نہیں دے رہے۔ جس کے نتیجے میں پاکستانی ذہین دماغ باہر چلا جاتا ہے۔ ہمارے ادائیگیوں کے سسٹمز ہی نہیں بنے ہوئے جس کے نتیجے میں ایشیا کا سارا آئی ٹی اور سافٹ ویئر کا کام چین، بھارت سمیت دیگر ممالک کے پاس چلا جاتا ہے اور ہم بیٹھ کر صرف آہیں بھرتے ہیں۔

دنیا کا مستقبل آرٹیفیشل انٹیلی جنس، بلاک چین اور نیٹ ورکنگ کے ساتھ ہے۔ دنیا کا مستقبل ڈیجیٹل ہے۔ جو بھی ممالک آج ان شعبوں میں کام کر رہے ہیں، وہ کل کو راج کریں گے، ان کی دنیا پر حکومت ہوگی۔ اگر ہم نے آج اس حقیقت کو نہ پہچانا تو کل بھی ہم یہی کہہ رہے ہوں گے "جو کروا رہا ہے، امریکا کروا رہا ہے" یا "یہ سب یہود و نصاریٰ کی سازش ہے تاکہ مسلمان غلام بن کر رہ سکیں"۔

خودکشی مسائل کا حل نہیں

ڈاکٹر میشال نذیر

جب سے یہ کورونا آیا ہے، ایک طرف تو زندگی تھم سی گئی، تو دوسری طرف اس سے ہونے والی اموات نے پوری دنیا میں غم کی فضا قائم کردی ہے۔ سب ہی منتظر ہیں کہ زندگی کی رونقیں کب بحال ہوں گی۔ اس سب میں آپ نے پوری دنیا سے مختلف شعبوں سے وابستہ لوگوں کی خودکشی کرنے کے بہت سے واقعات کے بارے میں سنا ہوگا۔ جب کوئی اپنا کسی بھی وجہ سے اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو صبر آجاتا ہے۔ یہ ایک قدرتی چیز ہے کہ سب نے جانا ہے، مگر جب کوئی خود ہی اپنی زندگی کا خاتمہ کرتا ہے، تو ان کے گھر والے کس اذیت سے گزرتے ہیں، یہ ہم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔

کچھ مہینے پہلے ایک خاتون نے اپنے اکلوتے بیٹے کی خودکشی کے بارے میں بتایا، جو کہ خود بچے سے ماہر نفسیات ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کا بیٹا خوش تھا، پڑھائی میں ٹھیک تھا، معاشی لحاظ سے بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ایک دن اچانک یونیورسٹی سے آکر اس نے خودکشی کرلی۔ ان کے محلے کی مسجد کے مولوی نے ان کے بیٹے کا نماز جنازہ پڑھانے سے ہی انکار کردیا، کیونکہ ان کے بیٹے نے خودکشی کی تھی۔ پھر اگلا مرحلہ رشتے داروں اور محلے والوں کے تیکھے سوال کہ ایسا کیا کردیا کہ خودکشی کی نوبت آگئی، وہ اب تک سہنے پر مجبور ہیں۔

میں جب امریکا میں تھی تو مجھے وہاں دل کے بڑے سرجنز میاں بیوی کے بارے میں پتہ چلا، جو ایک شادی میں مدعو تھے۔ وہ دونوں دل کے ڈاکٹر، انڈیا سے تھے۔ امریکا میں خوب نام بنایا، ان کے دو بچے تھے، بیٹا کمار اور بیٹی مینا۔ بیٹے نے امریکا میں ہی گوری سے شادی کی، مگر جلد ہی ان کے گھریلو جھگڑے شروع ہوگئے۔ جب شادی محبت کی ہو، تو نباہنا تو پڑتا ہے، پھر چاہے لوگوں کو دکھانے کیلئے ہی کیوں نہ ہو۔ وہاں شادی کرنا ایسا ہی ہے کہ شادی چل گئی تو چاند تک، نہیں تو رات تک۔ شادی کو پانچ سال ہوگئے، دو بچے بھی ہوگئے، مگر ان کے جھگڑے کم نہیں ہوئے۔ اور پھر ایک صبح کمار آفس کیلئے گھر سے نکلا، اور اپنی ہی گاڑی میں خود کو گولی ماری۔ اس کی موت کے بعد اس کے والدین اپنے پوتے اور پوتی تک سے نہیں مل سکتے، کیوں کہ ان کی بہو ملنے نہیں دیتی۔ وہاں کے قانون کے مطابق یہ ماں کی مرضی ہے کہ وہ بچوں کو دادا، دادی سے ملنے دے یا نہ ملنے دے۔ اس سانحے کے کوئی دو سال بعد ان کی بیٹی نے خود کو اس وقت گولی مار کر خود کی جان لے لی، جب اس کی بارات کا دن تھا، اور شادی بھی اس کی پسند کی تھی۔ اس جوڑے کے پاس نام، شہرت، پیسہ، سب ہے مگر اولاد کا سکھ نہیں ہے۔ اس لیے وہ مل کر اب اپنے ملک کے بچوں کیلئے فلاحی کام کرتے ہیں اور انہوں نے اپنی جائیداد اسی کام کیلئے وقف کردی ہے۔

ابھی پنجاب کے ایک علاقے میں ایک خاتون کی شوہر سے فون پر لڑائی ہوئی، جو کہ باہر رہتا تھا۔ اس خاتون نے اپنی تینوں بچیوں سمیت نہر میں چھلانگ لگادی۔ خود تو بچ گئی مگر بچیاں جانبر نہ ہوسکیں۔ ایک بچے نے تیم کی وجہ سے جان دی، تو دوسری طرف لڑکے لڑکی نے مل کر جان دی کیونکہ ان کی فیملیز ان کی شادی کے خلاف تھیں۔ ابھی ظفروال کے علاقے میں ایک باپ نے غربت سے تنگ آکر تین بچوں سمیت زہر پی لیا۔ ابھی کراچی میں ڈاکٹر بابا کی خودکشی کا معاملہ سامنے آیا، جو کہ ڈاکٹر ہونے کے ساتھ سوشل میڈیا پر ماڈل کے طور پر کافی ایکٹو تھی۔ ابتدائی تحقیق کے مطابق اس کے والد کے ساتھ اختلافات تھے اور اس کا قریبی دوست اسے اس کی کچھ تازہ تصاویر کیلئے بلیک میل کررہا تھا۔ سچائی سامنے آنے میں وقت لگے گا، مگر وہ اب واپس کبھی نہیں آئے گی۔ ایسے پتہ نہیں کتنے ہی واقعات آپ کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔ ہمارے لیے یہ محض ایک خبر ہوتی ہے، مگر جس گھر میں یہ المناک موت ہوتی ہے، ان کی حالت کا ہم اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔

ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کی رپورٹ کے مطابق پوری دنیا میں سالانہ 8 لاکھ لوگ خودکشی کرتے ہیں۔ یعنی ہر 40 سیکنڈ میں ایک خودکشی۔ اور پوری دنیا میں 15 سے 29 سال کے لوگوں کی موت کی دوسری بڑی وجہ خودکشی ہے۔ ڈبلیو ایچ او کی 2016 کی ایک رپورٹ کے مطابق خودکشی کا سب سے زیادہ رجحان یورپ میں رہا، اور دوسرے نمبر پر ساؤتھ ایسٹ ایشیا کا رہا۔ ڈیلی میل، لندن میں 11 اپریل 2020 کو جرمنی میں کیا گیا ایک سروے آرٹیکل ''کون سے گروپ کے لوگ زیادہ خوش رہتے ہیں'' شائع کیا گیا، جس میں 67,500 لوگوں کا انٹرویو کیا گیا۔ اس سروے کے مطابق جو لوگ مذہب کو مانتے ہیں، وہ طحد یعنی کوئی بھی مذہب نہ ماننے والوں کے مقابلے میں زیادہ خوش ہوتے ہیں، اور مذہب ماننے والوں میں سب سے زیادہ خوش مسلمان اور دوسرے نمبر پر عیسائی ہیں۔ ہم وہ خوش نصیب ہیں جو مسلمان پیدا ہوئے، وہ دین جو کہ مکمل ضابطہ حیات ہے، مگر ہمارے ہاں بھی اب خودکشی کے واقعات میں اضافہ ہورہا ہے۔

ہمارے ہاں خودکشی کی وجوہات میں غربت، پڑھائی میں اچھے گریڈ نہ لانا، گھریلو جھگڑے، پسند کی شادی نہ ہونا، ڈپریشن اور آج کل سائبر کرائمز کے ذریعے لڑکیوں کو تصاویر یا ویڈیوز کیلئے بلیک میل کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

خودکشی کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہوسکتی، کتنے ہی مشکل حالات کیوں نہ ہوں، مسائل کا سامنا کیجئے، ان سے بھاگیں نہیں۔ زندگی میں بہت دوست ہونا بالکل بھی ضروری نہیں ہے، بس ایک اچھا دوست ہی کافی ہے، جس سے آپ دل کی ہر بات کہہ سکیں۔ کیونکہ جب دل پر مسائل، مشکلات اور پریشانیوں کا بوجھ بڑھ جاتا ہے، تبھی دماغ آپ کو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا کرتا ہے اور دماغ ایسے کیمیکل پیدا کرتا ہے جو آپ کو خودکشی کرنے پر اکساتے ہیں۔ اس لیے دل پر بوجھ نہ بننے دیجئے۔ اور اس کا سب سے آسان نسخہ اللہ کو یاد کرنا، اس کا شکر کرنا اور اس پر بھروسہ کرنا ہے۔

کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں، صبر اور شکر کا دامن کبھی بھی نہ چھوڑیے۔ ہر انسانی زندگی عروج اور زوال کی داستان ہے، اور یہ دونوں کسی کی زندگی میں زیادہ دیر نہیں ٹکتے۔ اور ان میں سے کس کا دورانیہ زیادہ ہوگا، یہ سراسر خود انسان پر منحصر ہے کہ وہ ان کو ڈیل کیسے کرتا ہے، تو جو بویا وہی سکندر۔

ABC CERTIFIED

Pakistan's 1st Human Rights Educator

13 YEARS

Service to Human Rights Publications

HUMAN RIGHTS POST

HRP

Vol:13 Issue 12 December 2020

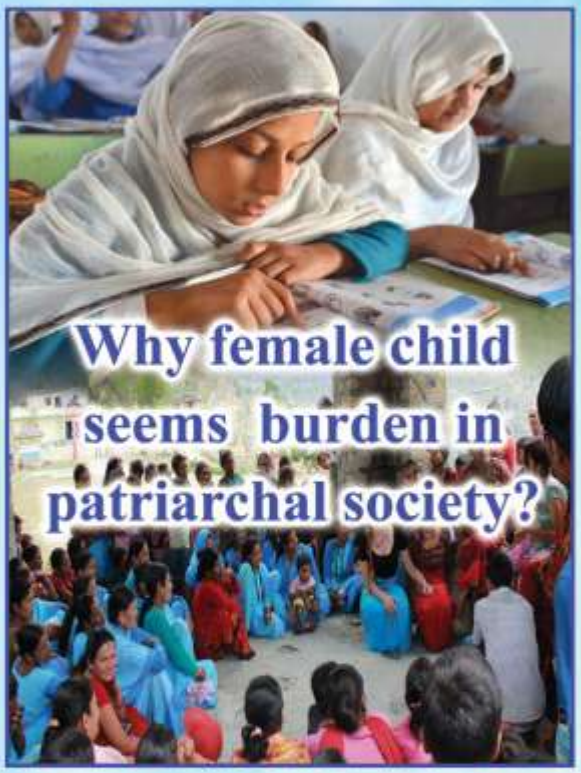

Why female child seems burden in patriarchal society?

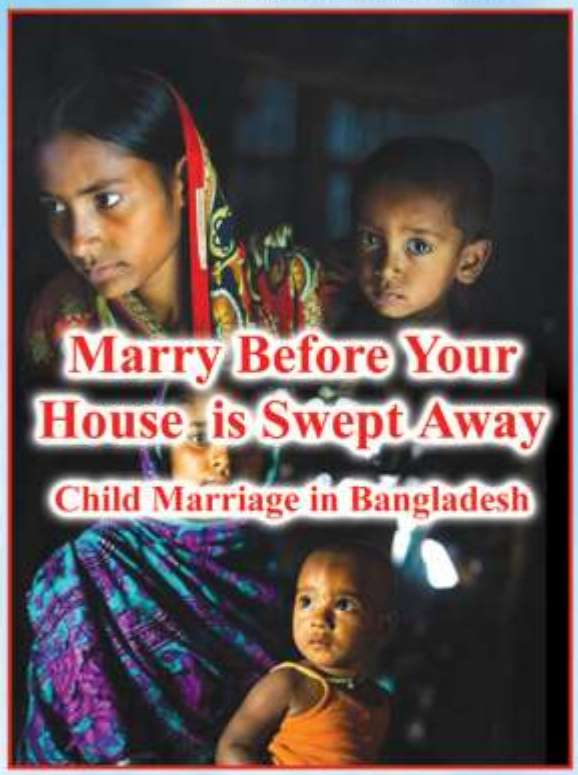

Marry Before Your House is Swept Away

Child Marriage in Bangladesh

The REAL face of COVID-19 in Pakistan

Regd:SS-No.12660

Marry Before Your House is Swept Away

Child Marriage in Bangladesh

"This is a place affected by river erosion," Azima B.'s parents told her, explaining why she had to marry at age 13. "If the river takes our house it will be hard for you to get married so it's better if you get married now." Azima said that people in the community had been "shaming her" for still being unmarried because she is tall and looks old for her age. "I protested a lot to my parents but they said, 'It is a shame for us to keep you in the house.' I wanted to continue my education, but my mother said, 'Your father has fixed your marriage and if you don't listen to your father, people will say what kind of girl is that who doesn't listen to her father?'"

Azima said, "I am the oldest and only after I get married can [my sisters] think about getting married. If the river takes the house it will be hard for them to get married." Azima's sisters are ages 12, 10, and 8 years old; her parents are now considering a marriage for the 12-year-old.

Azima married a 17-year-old boy three days after his parents decided she was an acceptable bride.

"They've already asked me to have children," Azima, now age 14, said of her in-laws. "I live in their house—I have to keep them happy. My husband has also asked me to have children. I said I wanted to wait for two years, but they said, 'No, you should have children now.' So I guess I will have to have children now."

Bangladesh has the fourth-highest rate of child marriage in the world after Niger, the Central African Republic, and Chad, according to the United Nations children's agency, UNICEF. In the period 2005 to 2013, according to UNICEF, 29 percent of girls in Bangladesh married before the age of 15 and 65 percent married before the age of 18. Child marriage around the world is associated with many harmful consequences, including health dangers associated with early pregnancy, lower educational achievement for girls who marry earlier, a higher incidence of spousal violence, and an increased likelihood of poverty.

Research shows that globally girls aged 10-14 are five times more likely to die during delivery than mothers aged 20-24; girls aged 15-19 are still twice as likely to die during delivery than women aged 20-24. The link between lack of or poor education and child marriage is borne out by research finding that in Bangladesh women with primary, secondary, and higher education, compared to women with no formal education, were respectively 24 percent, 72 percent, and 94 percent less likely to marry at a young age. A study across 7 countries found that girls who married before the age of 15 were more likely to experience spousal abuse than women who married after the age of 25. Global data shows that girls from the poorest 20 percent of families are twice as likely to marry before 18 as girls whose families are among the richest 20 percent.

In other respects, Bangladesh has been cited as a development success story, including in the area of women's rights. The UN cited Bangladesh's "impressive" poverty reduction from 56.7 percent in 1991-1992 to 31.5 percent in 2010. Bangladesh has achieved gender parity in primary and secondary school enrollment, according to the UN. Maternal mortality declined by 40 percent between 2001 and 2010.

Bangladesh's success in achieving some development goals begs the question why the country's rate of child marriage remains so high. This report aims to help answer that question and suggest ways in which Bangladesh's government can apply effective strategies to achieve comparable success in reducing child marriage.

In Bangladesh there are several factors driving the high rate of child marriage. Gender discrimination feeds social attitudes and customs that harm girls at every stage of their lives and fuel the country's extremely high rate of child marriage. Desperate poverty remains a daily reality for many families in Bangladesh, and many parents see child marriage as their best option to safeguard the future of a daughter they feel they can neither feed nor educate nor protect. Bangladesh's status as one of the countries in the world most affected by natural disasters and climate change adds an additional element of hardship to many families, especially those living in the most marginal and disaster-affected parts of the country.

Bangladesh's government has responded to the growing attention to the harms linked to child marriage by promising swift action. At the July 2014 Girl Summit in London, Bangladesh's Prime Minister Sheikh Hasina pledged to take steps to reduce child marriage in Bangladesh and to ultimately end it by 2041. She committed, by 2021, to end marriage for girls under 15 and reduce by more than one-third the number of girls between the

ages of 15 and 18 who marry. As part of this effort, she pledged that her government would revise Bangladesh's law which prohibits child marriage, the Child Marriage Restraint Act (CMRA), before 2015, develop a national plan of action on child marriage by the end of 2014, and take other steps to change social norms and engage civil society in the fight against child marriage.

Sheikh Hasina's efforts to follow through on the commitments she made at the Girl Summit have already been marred by delay. One reason for this was a debacle over a proposal to revise the CMRA by changing the age of marriage in Bangladesh to 16 years old for girls and 18 years old for boys. This proposal was vigorously opposed by civil society activists in Bangladesh, as well as international experts. At the time of writing, the government still appears to be pushing forward with this proposal, while the process of reforming the law has been delayed. The development of a national plan of action on ending child marriage has also been delayed and is not complete at the time of writing.

This report aims to support the commitments Bangladesh's government has made to ending child marriage by documenting the experiences and insights of child brides and their family members. Human Rights Watch interviewed 114 people for the report in late 2014. The majority of those interviewed were girls and women who experienced child marriage first-hand. Their experiences highlight some successes in reducing child marriage in Bangladesh, but also many areas where the Bangladesh government can and should do more.

The legal age of marriage in Bangladesh is currently 18 for women and 21 for men. Bangladesh's Child Marriage Restraint Act (CMRA), first passed in 1929 and subsequently amended several times, makes it a criminal offense to marry or facilitate the marriage of a girl under 18 or a man or boy under 21, but the law has rarely been enforced and is widely ignored.

When asked about how they had made decisions about when their daughters should marry, families interviewed for this report talked again and again about poverty. Girls described parents deciding to marry them off simply because the family was going hungry. Many families also linked poverty, education, and child marriage, saying that they arranged a marriage for their daughter because they were too poor to keep her in school. Many of the families interviewed are so poor that even the smallest expense associated with school, for example, exam fees which may be as little as US$0.13, is unaffordable. Social norms and gender discrimination lead parents to view their sons as future economic providers and their daughters as burdens who eventually leave for their marital home—meaning that families are more likely to pull their daughters from school first when money is short. Poverty also prevents boys from attending school. Schools do little to retain students, prevent child marriages, or educate students about sexual and reproductive rights and the fact that child marriage is illegal and harmful.

One of the major factors pushing these families into such desperate poverty is natural disasters. Bangladesh's extreme vulnerability to natural disasters, exacerbated by climate change and combined with its large population, means that for many poor families their livelihoods, homes, and land are under threat from flooding, river erosion, cyclones, and other disasters.

Some families interviewed by Human Rights Watch said they had made decisions about marriage for reasons directly related to natural disasters—some, for example, rushed to marry off a daughter in anticipation of losing their home to river erosion. Other families described natural disasters as a recurring stress factor, taking food from the family's mouth and making child marriage seem like the best option for a girl and the family.

Harassment and intimidation also played a major role in driving child marriage. Unmarried adolescent girls often face unwanted advances and threats, including the threat of abduction from suitors, and parents, feeling unable to protect their daughters and with no prospect of help from police or local authorities, see marriage as a solution. Families are also influenced by social pressures from neighbors in communities where the onset of puberty in a girl is seen as a signal that it is time for her to marry. The widespread practice of girls' families paying dowry to her groom creates additional pressure, as dowry tends to be lower and even avoidable for the youngest of brides. Boys are also the victims of child marriage in Bangladesh, though it is estimated that the rate of child marriage is 11 times higher for girls than boys.

"My life is destroyed" is how one girl described the effect child marriage had on her. Human Rights Watch interviews with married girls in Bangladesh found they almost always left education permanently. They became pregnant early, either because they were pressured to or felt that they should, or because they had no access to contraception and information about family planning. Even if they left their husbands or got divorced early, economic and social pressures often kept them from resuming their studies. Some suffered health problems as a result of early pregnancy, and many suffered violence and abuse in their home. Some of the most heartbreaking stories were from girls who had been abandoned or cast out by abusive husbands and in-laws, yet were begging to be taken back, for lack of other options.

The efforts and promises of Bangladesh's government to end child marriage have not translated into adequate action. Reforms like the government's expansion of birth registration are important because, if implemented effectively, they could play a key role in ending child marriage by allowing accurate verification of a person's age to determine if they are old enough to legally marry. However, Human Rights Watch's research shows that local officials routinely take bribes to provide false birth certificates in order to

facilitate child marriages. The government has taken important strides in facilitating access to education by banning primary level school fees. However, other costs associated with attending school mean that education remains out of reach for too many children, and for girls the consequence of lack of access to education can be child marriage. Government agencies providing assistance to families in poverty or affected by disasters should be more directly involved in preventing child marriage. Bangladesh's law on child marriage should be reformed, but even more importantly, it should be fully enforced.

International law prohibiting gender discrimination requires that the age of marriage be the same for both women and men, and evolving international standards set 18 as the minimum age. Setting a higher age of marriage for men, even when the minimum age of marriage for women is 18, is a harmful form of gender discrimination which reinforces social norms about older men marrying younger girls. International law also provides every individual the right to freely choose whether and whom to marry and to defer marriage until she or he has reached sufficient age to be capable of free and full consent. Bangladesh's obligations under international law also compel it to protect its peoples' rights to education and health and to be free from physical, mental, and sexual violence.

In many of the villages Human Rights Watch visited in the course of researching this report, child marriage is not only socially acceptable but also expected. As long as the government looks the other way, or even facilitates child marriage, for example, when local government officials provide forged birth certificates, marrying off young daughters will be a survival strategy for parents who feel unable to care for their children or fear the consequences of strong social stigma against unmarried girls. The stories in this report explain the hard choices families face, and the ways in which the government is failing to prevent child marriage.

The Bangladesh government's high-level political commitment to end child marriage is a positive step. But it will not achieve its targets unless child marriage becomes a permanent priority for all parts of the government and is backed up by effective legislation, policies, and programs.

Key Recommendations

To the Government of Bangladesh

Comprehensively reform the Child Marriage Restraint Act (CMRA) by the end of 2015. Reform of the CMRA should include:

Setting the minimum age of marriage at 18 for men and women with no exceptions;

Expanding measures to prevent child marriage;

Providing assistance to married children and adults who married as children.

As per the prime minister's commitment at the July 2014 London Girl Summit, produce a national plan of action to end child marriage by 2041, and fully incorporate this plan of action into the government's seventh 5 year plan for fiscal years 2016 through 2020. Ensure that the plan is adequately resourced.

Make marriage registration compulsory for all religions. Create digital records that are accessible throughout the country as proof of marriage.

Initiate a nationwide awareness campaign against child marriage in a variety of media and in formats accessible to those with disabilities and limited literacy, emphasizing the health risks of early pregnancy, the benefits of girls' education, the law prohibiting child marriage, the consequences for those who break the law, and the mechanism for reporting child marriage and obtaining assistance.

Eliminate all costs to students and parents for textbooks, education materials, exams, and uniforms for all children in compulsory education, and take steps to alleviate the negative effects of other indirect costs on children from poorer households.

Coordinate with schools to monitor problems of harassment of female students and intervene to prevent and end harassment, including by contacting law enforcement authorities in cases involving alleged criminal acts.

Incorporate a detailed module on sexual and reproductive health into the national curriculum as an examinable, independent subject and ensure that it is taught in all schools.

Investigate all complaints of child marriage promptly, intervene to prevent child marriage whenever possible, and refer for prosecution anyone who has committed a crime under the CMRA, including officials who solemnize child marriages and those who provide forged birth certificates to facilitate child marriages. Establish a mechanism to receive and investigate reports of local government officials providing forged birth certificates. Dismiss and refer for prosecution any officials found to have forged birth certificates.

To International Donors and the United Nations

Encourage the Bangladesh government to pass a reformed CMRA in 2015 which complies with international law and best practices and sets the minimum age of marriage at 18 years for both women and men with no exceptions.

Encourage the Bangladesh government to develop a comprehensive national strategy to end child marriage through a broad consultative process, participate in its development, and support its implementation. Integrate strategies to prevent child, early, and forced marriage and to support married girls into assistance programs.

Methodology

This report is primarily based on research conducted in Bangladesh in September, October, and November 2014. A Human Rights Watch researcher carried out a total of 114 individual and group interviews, including 59 interviews with girls and young women who had married before the age of 18 in the last 5 years.

Interviews with girls and young women affected by child marriage, family members, and local officials were conducted in the districts of Noakhali, Laxmipur, Khulna, Sirajganj, and Gaibandha. Child marriage is a problem across all regions of Bangladesh, in both rural and urban areas. We chose to conduct research in districts across four different regions of the country in an effort to capture regional variations in the causes and consequences of child marriage. We also selected these districts in part because they all contain extensive areas where there is significant impact from natural disasters, including cyclones, river erosion, and flooding. One of the goals of this research was to determine whether there were specific vulnerabilities to child marriage in areas affected by natural disasters. The majority of, but not all, interviewees lived or had lived in areas significantly affected by natural disasters.

The most recently married girl we interviewed was a 15-year-old who had married 3 days prior to the interview. The youngest married girl we interviewed was 10 years old. The researcher also interviewed

fathers and mothers, most of whom were parents of child brides, but a few of whom were individuals who had resisted community norms and chosen to delay their daughters' marriages.

Because most of these interviews were conducted in homes in villages, the researcher, in addition to hearing peoples' stories, also often got a firsthand look at the living conditions in which interviewees lived. These often consisted of large extended families living in one or two room shacks. Virtually all homes had mud floors and some were built entirely from bamboo, leaves, and tarpaulins.

The interviews were conducted in Bangla through a female interpreter. All interviewees were advised of the purpose of the research and that the information they shared would be used for the purpose of this report. They were advised of the voluntary nature of the interview and that they could refuse to be interviewed, refuse to answer any question, and terminate the interview at any point. The majority of interviews were recorded, with the interviewees' consent, for later reference; all interviewees could refuse having the interview recorded.

Most interviews were conducted with only the interviewee, translator, and Human Rights Watch researcher present, but in some cases the interviewee requested that another person be present. A few interviews were conducted with family groups. Interviewees were only asked about abuse within their marriage, including sexual violence, when the interview was taking place in private. All interviewees were already connected with local NGO representatives who have some capacity to assist with obtaining legal and medical services where needed.

Twenty-four interviews with local officials, teachers, NGO workers, and representatives of international organizations provided context and information about the policy and legal framework relevant to child marriage in Bangladesh. Interviews with national and international NGOs and international organizations were conducted in Dhaka.

Human Rights Watch shared our findings with the government of Bangladesh and requested a response from the government within about three weeks through a letter sent by email, fax, and courier service on February 18, 2015. The letter was copied to the government institutions which are the focus of recommendations of this report; a copy is included in this report as an appendix. At the time of publication, Human Rights Watch had not received any response to the letter.

All interviewees' names have been changed to pseudonyms or withheld to protect their privacy.

The exchange rate at the time of the research was US$1 = 77 Bangladesh taka; this rate has been used for conversions in the text, which have generally been rounded to the nearest dollar.

I. How Girls Become Brides: Contributing Factors to Child Marriage

"River erosion took our house, so we came here," Beauty A. said. "We didn't know anyone so we were vulnerable so my husband was able to threaten us. He told my father, 'I will marry your daughter or I will burn your house down.' My father had refused to give me to him because he already had a wife, but then he threatened us."

Beauty's father eventually agreed to the marriage and Beauty married. She is not sure what her age was when she married, but she believes she is about 40 now, and her oldest child, a son, is 25. She and her husband had three children before he abandoned the family and returned to his first wife. Beauty struggled to feed her children on her own, in part because of flooding. "When it rains everything gets destroyed—a lot of agriculture gets destroyed. If the crops are destroyed, there is no work for us." For the last two years, she said, the situation has been much worse because a new embankment built two years ago by the government blocks the water from receding and has increased the flooding and resulting crop destruction.

Beauty took her two daughters out of school after class five and class three because even though the school was free, she could not afford stationery, pens, and uniforms. She arranged marriages for both daughters when they reached age 15. "I know the right age to get married is 18," she said in relation to her younger daughter who had married three months earlier. "But I don't have enough money to feed her."[1]

Bangladesh has the fourth-highest rate of child marriage in the world, after Niger, the Central African Republic, and Chad, according to the United Nations children's agency, UNICEF.[2] About 74 percent of Bangladeshi women currently aged 20 to 49 were married or in a union before age 18, despite a minimum legal marriage age for women of 18.[3] In the period 2005 to 2013, according to UNICEF, 65 percent of girls in Bangladesh married before age 18, and 29 percent married before age 15.[4]

UNICEF data indicates that the rate of marriage among girls under the age of 15 in Bangladesh is the highest in the world.[5] In absolute numbers, Bangladesh is the country in the world with the second-highest total number of women aged 20 to 24 years old who were married or in a union before age 15, after India.[6] Two percent of girls in Bangladesh are married before age eleven.[7]Boys are also the victims of child marriage in Bangladesh, though it is estimated that the rate of child marriage is 11 times higher for girls than boys.[8]

While the rate of child marriage in Bangladesh is high across all parts of the country and all demographic groups, research shows that some girls are at higher risk than others. A heightened incidence of child marriage is associated with living in rural areas, receiving less education, and poverty. The United Nations Population Fund (UNFPA) found in 2007 that 70 percent of girls living in rural areas in Bangladesh are married before age 18, compared to 53 percent of girls in urban areas.[9] 80 percent of women with no education and 80 percent of women with only primary education married before 18, compared with 57 percent of women who studied at least to secondary school.[10] Girls from the poorest 20 percent of families are twice as likely to marry before 18 as girls whose families are among the richest 20 percent.[11] Recent research has suggested that there is also an increased risk of child marriage in Bangladesh in areas affected by natural disasters associated with climate change.[12]

In other ways, Bangladesh has been cited as a development success story, including in the area of women's rights. The UN cited Bangladesh's "impressive" poverty reduction from 56.7 percent in 1991-1992 to 31.5 percent in 2010.[13] Bangladesh has achieved gender parity in primary and secondary school enrollment, according to UN figures.[14] Maternal mortality reportedly declined by 40 percent between 2001 and 2010.[15]

Bangladesh's development achievements have occasioned particular comment by experts because they have occurred in spite of weak governance and high corruption, a phenomena often referred to as the "Bangladesh paradox." As the Economist wrote in 2009, "Of course, no one ever believed in such a paradox. It was a polite way of telling politicians that the country could do even better if they kept their hands out of the till."[16]

The United Nations University attributes Bangladesh's successes in significant part to the economic growth the country has enjoyed due to two key factors: growth of the garment industry and remittances sent by the growing numbers of Bangladeshis who have migrated overseas in search of work.[17] It also noted with approval the Bangladesh government's willingness to permit NGOs to deliver crucial services, an approach that has led to flourishing Bangladeshi NGOs in some sectors becoming models for other countries.[18]

The United Nations and others have warned, however, that in an environment where Bangladesh's governance has become not stronger, but instead increasingly compromised, Bangladesh is likely to struggle to maintain its progress on these development indicators.[19] Rising economic inequality in the country, as well as the increasing threats posed to Bangladesh by climate change, are of particular concern.[20]

Bangladesh's success in achieving some development goals begs the question of why the country's rate of child marriage remains among the worst in the world. This report aims to help answer that question and suggest ways that the Bangladesh government can apply effective strategies to achieving comparable success in reducing child marriage.

Brazil: Revoke Regulation Curtailing Abortion Access

Reporting Rape Survivors to Police Can Endanger Their Health

Women hold a banner calling for "legal, safe and free abortion," during a protest in front of the municipal theater in Rio de Janeiro. © 2018 Fernando Frazão/Agência Brasil

Brazilian authorities should revoke a Health Ministry regulation that erects new barriers to legal abortion access, Human Rights Watch said today.

Among other measures in the August 27, 2020 regulation that could discourage women and girls from accessing legal abortion, it requires medical personnel to report to the police anyone who seeks legal termination of a pregnancy after rape, regardless of the rape survivor's wishes. The Ministry of Family, Women, and Human Rights has also announced it will create a hotline for medical personnel that could be used to report women and girls whom they suspect had an illegal abortion.

"Instead of ensuring that rape survivors have access to legal abortion, the government is adopting policies that could discourage women and girls from seeking support and medical care after sexual violence," said Tamara Taraciuk Broner, acting deputy Americas director at Human Rights Watch. "Brazilian authorities should urgently revoke these new regulations, which increase the risk that women and girls will resort to unsafe abortions that could endanger their lives and health."

Media reported that Health Minister Eduardo Pazuello said at a September 17 closed-door meeting with senators that he is willing to change some articles in the regulation. He should revoke it all, Human Rights Watch said.

The Supreme Court could temporarily suspend the regulation and then revoke it, in response to two petitions it is scheduled to examine on September 25. The federal Public Defender's Office and 11 state Public Defender's Offices have also asked a federal court in São Paulo to revoke the regulation. Brazil's Congress could approve one of several bills introduced to revoke the regulation.

The new regulation orders doctors and other health professionals to collect evidence and report to the police when a woman seeks to terminate a pregnancy that is the consequence of sexual violence. The regulation maintains a previous requirement for medical personnel to question women and girls to obtain a detailed account of the type and form of violence they suffered and, when possible, to identify witnesses and describe the rapist.

The regulation says the information should be treated as "confidential," but at the same time, it requires medical personnel to hand over that supposedly confidential information to the police, Human Rights Watch said. Medical personnel would have to report all rape cases to the police, without asking for the survivors' consent.

It also requires doctors to offer rape survivors who seek a legal abortion to see the fetus through an ultrasound exam. Given the emotional distress that even receiving such an offer, let alone seeing the fetus, can cause rape survivors, the requirement seems designed to dissuade them from having a legal abortion and to delay their care, Human Rights Watch said.

The regulation maintains a requirement for rape survivors

seeking a legal abortion to sign a statement of responsibility with an "express warning" that if it "does not correspond to the truth" they could be prosecuted for fraud and illegal abortion, punishable with up to five and three years in prison, respectively.

Abortion is legal in Brazil in cases of rape, when necessary to save a woman's life, or when the fetus has anencephaly-a condition that makes it difficult for the fetus to survive. To have a legal abortion, a woman or girl needs approval from a doctor and at least three members of a multi-disciplinary team-made up of an obstetrician, anesthetist, nurse, social worker and/or psychologist.

Human Rights Watch has repeatedly urged the authorities to expand access to safe and legal abortion in Brazil, saying that the country's harsh abortion restrictions are incompatible with its obligations under international human rights law. The new regulations, by making access to legal abortion even more difficult, further threatens the rights to life, health, privacy and medical confidentiality, nondiscrimination, and to be free from cruel, inhuman or degrading treatment.

In a country of 210 million people, only 42 hospitals are performing legal abortions during the Covid-19 pandemic, according to a study by the nonprofit group Article 19 and the news websites AzMina and Gênero e Número. In 2019, it was 76 hospitals.

Lack of access to a hospital that performs legal abortions, denials of access to legal abortion at those hospitals, stigma, and fear of criminal prosecution can push women and girls who would have a right to a legal abortion - and those whose pregnancies fall outside the narrow exceptions included in Brazilian law and regulations - to have potentially life-threatening illegal abortions. Those factors can also keep them from seeking post-abortion care when they experience complications from unsafe procedures or miscarriages.

An estimated one in five women in Brazil has had an abortion by age 40 - the overwhelming majority outside the health system. Every year, an estimated 200 women die from complications from unsafe abortions, according to the Health Ministry.

Women, Family, and Human Rights Minister Damares Alves announced the new hotline for medical personnel to report "violations of human rights" on July 13. A director at the ministry told Human Rights Watch that while the hotline, which is not yet operational, is intended for reporting violence against children, medical personnel could also report suspected illegal abortions.

The ministry should ensure that the hotline does not become a means for medical personnel to report women they suspect had an unsafe and illegal abortion, Human Rights Watch said.

In Rio de Janeiro, health personnel reports to police led to almost a third of all prosecutions of women for illegal abortion between 2005 and 2017, according to the Rio Public Defender's Office.

President Jair Bolsonaro, and Minister Alves frequently speak against sexual and reproductive rights. In June, Minister Pazuello removed two public servants after President Bolsonaro misrepresented a technical note they had signed as a proposal meant "to legalize abortion." The note did not advocate changing Brazil's abortion laws but called for maintaining sexual and reproductive health services during the Covid-19 pandemic, such as services for victims of sexual violence and access to contraception and to "safe abortion in the cases contemplated by Brazilian law."

The new regulation will also compound the problem of gender-based violence by intimidating rape survivors and limiting their access to health services, Human Rights Watch said.

"Forcing doctors to act as criminal investigators does not address Brazil's failure to adequately enforce laws to prevent, prosecute and punish gender-based violence," Taraciuk Broner said. "Instead, it creates an additional risk of trauma for rape survivors, compromises medical confidentiality and is one more barrier to accessing lawful abortion services."

Technology And Social Life!

Over the past two decades, technology has profoundly affected the individual and collective lives of human beings. Today's man sees life through the prism of technology, nothing seems to be at first hand.

If we look at some ten years ago, life was filled with colors. Relationships, Family and Friends were the priority. People used to sit together, talk with one another, spend time with their friends and family. But today siblings sitting in the same room talk to each other through instant messaging or WhatsApp, even the well being of their family members come in their knowledge through Facebook or WhatsApp statuses.

Previously, there used to be a Single Television in one house or going a little back Television at one house in the whole colony, the whole neighborhood used to gather to watch the night news and matches, everyone used to sit together and enjoy, today there is one or more television in

every house but no one watch it the way it was previously watched.

Today, everyone has smart phones, so even if the whole family is sitting together for dinner, more than half of the members are busy in their phones.

Children used to play games like cricket and hide and seek in the streets. In month of June, after Zuhar when all elders used to sleep, cricket ball would break glass of someone's window and all uncles would gather.

The children used to run away by knocking on the doors of houses. People used to get annoyed by this but they also used to laugh at the innocence of children.

But then the time changed, now kids of four years know how to use Smart Phone, they all have smart phones and tablets with them. They are immersed in the screens and do not even know the value of outdoor games, friends and family.

Technology has brought us Socially Closed, but has quarantined us from the real colors of life, importance of family and friends.

Today everyone is living a life full of lies and deception, we pretend to be what we are not, this pretense has made the world duplicitous. Nothing seems to be at First Hand, it's a "Second Hand Living" actually.

Ecuador: High Levels of Sexual Violence in Schools

Investigations, Justice, Reparations Needed

Thousands of children and adolescents have suffered school-related sexual violence in Ecuador since 2014, Human Rights Watch said in a report released today. While Ecuador has taken important steps to tackle the issue and expedite justice since 2017, its policies and protocols are still not adequately carried out by many schools, the prosecutor's office, and the judiciary.

"'It's a Constant Fight': School-Related Sexual Violence and Young Survivors' Struggle for Justice in Ecuador," documents sexual violence against children from preschool through higher secondary education, and the serious obstacles young victims and their families face when seeking justice. Human Rights Watch found that teachers, school staff, janitors, and school bus drivers have committed sexual violence against children of all ages, including children with disabilities, in public and private schools. Ongoing cases show that sexual violence against students continues.

"Ecuador has failed to protect many children and adolescents from school-related sexual violence, impacting their whole lives, including their rights to education, to redress, and their sexual and reproductive rights," said Elin Martinez, senior children's rights researcher at Human Rights Watch and the report's author. "Serious gaps in Ecuador's education and justice systems leave many children and adolescents unprotected, exposed to horrific abuses, stigmatized for reporting abuse, and at risk of retraumatization."

According to government data analyzed by Human Rights Watch, between 2014 and May 2020, 4,221 students suffered school-related sexual violence. From February 2019 to September 2020, Human Rights Watch interviewed 83 people, including survivors and their families, lawyers, and prosecutors, and analyzed 38 cases and official data on school-related sexual violence. Cases documented involved rape and sexual abuse, including forcing children to perform sexual acts on school premises or outside school grounds. Students also sexually abused, harassed, and carried out online sexual violence against fellow students. Some survivors faced harassment, bullying, and intimidation after reporting the abuses, from teachers, principals, abusers' families, and parent-school associations.

Sexual violence has been a long-standing pervasive problem in Ecuador's educational institutions. The scale only became public in 2017, when the National Assembly set up a cross-party commission to investigate school-related sexual violence cases, after an outcry from families affected. The commission, named AAMPETRA after a case involving sexual abuse of 41 children at the Academia Aeronáutica Mayor Pedro Traversari, a private school in southern Quito, evaluated actions taken by state institutions to prevent and stop abuses in schools and provide adequate access to justice, focusing on cases between 2013 and 2017. It found that former ministers under President Rafael Correa's government failed to address sexual violence.

In July 2017, the incumbent government of President Lenín Moreno disclosed data showing high levels of sexual violence in schools, and declared a zero-tolerance policy. It adopted a binding protocol requiring teachers, school counselors, and other staff to report allegations of sexual violence within 24 hours. It created a comprehensive database and tool to track the reporting of cases, investigations, and prosecutions.

But Human Rights Watch found severe gaps in carrying out this policy and ensuring adherence to its binding protocols. The effort is significantly affected by the serious shortage of school counselors and psychologists, who are instrumental in detecting and reporting cases. In some schools or districts, counselors have little support, and teachers, school officials, and district authorities discourage them from filing complaints. The government also appears to have failed to enforce its policies in private schools.

Many children, and their families, also faced serious hurdles when seeking justice. Judicial proceedings are often delayed and not always conducted in children and adolescents' best interests. Data from the Prosecutor's Office analyzed by Human Rights Watch shows that between 2015 and 2019, only three percent of reported cases of sexual violence went to trial. Most families felt that they had to fight for justice, sometimes exhausting their financial resources, affecting the entire family's mental health and well-being.

In 2020, the Inter-American Court of Human Rights heard the court's first case on school-related sexual violence. It found Ecuador responsible for abuses against Paola Guzmán Albarracín, a secondary school student raped by her school's deputy principal for over a year. She took her own life in 2002. The court ordered Ecuador's government to provide full reparations to Paola's family and hold a high-level public ceremony to publicly recognize its international responsibilities by December 2020.

Prior to leaving the presidency in May 2021, President Moreno should ensure that all measures the Inter-American court ordered in June take effect or are on course within the time periods prescribed by the court, Human Rights Watch said. Moreno should also promptly provide a public apology to all survivors of school-related sexual violence.

Moreno's government should swiftly establish a national reparations fund for survivors of sexual violence, with a monitoring system to ensure that government institutions fully comply with national court orders.

Ecuador should adopt a long-term zero tolerance state-led agenda, with a strong emphasis on preventing further cases, and adequately responding to those that do occur, Human Rights Watch said. The government should increase resources to prevent and respond to sexual violence in educational institutions and restore budgets for its national policies to prevent gender-based violence and teenage pregnancies.

It should also increase and ensure support for school counselors and psychologists, ensure that all public and private schools are equally accountable for reporting cases of sexual violence, and guarantee that all allegations are adequately investigated. Judicial institutions should ensure that proceedings properly accommodate children and adolescents and support their families, upholding their rights to a fair trial and restorative justice.

"Ecuador's actions in recent years to acknowledge and address sexual violence in its schools are important, but it should also focus on preventing further abuses," Martinez said. "All teachers, and school and government officials need to protect students, and ensure that children and adolescents feel safe in schools to make zero tolerance a reality."

Why female child seems burden in patriarchal society?

The reason why our country lags behind in various economic sectors is because our women are trapped inside a bubble of social inequality where men do not allow them to come forward and prove their worth on equal footing

In times of ignorance, a girl when born was not even allowed to take few breaths and buried by her male guardians in order to avoid shame (associated with the birth of a female child) or escape the burden of her existence. The brutal tradition, however, got obliterated, following the teachings of Holy Prophet (PBUH) but, unfortunately, the old traces of such ignorance, in other forms, are still existing today. In a society as that of Pakistan where Islam is being misused in settling most of the social affairs and family dealings, mistreating a girl and depriving her of her major rights are no exception.

Right from the day when a girl is born, she is being realised that she is inferior to her male counterparts and has to compromise on all the decisions of her life. Be it her father, brother, husband, or a male relative, she has to keep her voice low at all the family occasions and is not allowed to express her emotions loudly and enthusiastically. She has to adjust herself according to the environment that her family prefers and at times, has to give up on her dreams in order to fulfil their expectations. If she is found fighting off the cultural taboos overcoming her intrinsic fears, she has to face criticism not only from the society but also from her family members especially her paternal side (as most South Asian families are against a girl's liberty and independence).

'Iran's ties with Syria are strategic,' Tehran vows to continue supporting Syrian govt

In a male dominant society, a girl feels nothing less than a burden upon her family or perhaps someone who always brings misery from the day she acquires her existence. Given the existing gender gap in all the social sectors, parents have to struggle enough to satisfy her needs especially providing her basic education and getting for herself a safe shelter. Luckily, if they desire to make her a self-sufficient person working independently, they literally have to walk on the heated coals to maintain her reputation in the society and guard her chastity owing to the prevalence of unwise social practices and no provision of expected justice. Most of the parents, as a consequence, do not seek daughter as a child so that they can easily avert the double burden - a burden to raise her and to protect her virginity.

Considering a girl as a "burden", parents often want to marry her at a very early age due to societal pressure and under the pretext of "discharging their responsibilities on time" without letting the girl complete her education and attaining enough maturity. The curse of dowry has also made them dispose of her in marriage as early as possible as they fear they might get short of money with time to satisfy the materialistic needs of her in-laws, hence, face disgrace. Contrarily, this is not the case for a male child. With having a son in parallel, parents feel more blessed and are found to invest happily on him because they think he will support the family, bringing both money and a girl, after his marriage and it is comparatively better to spend more on him in order to ensure a safe social and financial return while daughters on the other hand, have to leave their house one day so it would be a half-witted idea to invest on her growth and well-being. It is a common sight in the mainstream society where having a son means gaining "izzat and fakhar" and having a daughter means acquiring "boojh or zillat". Perhaps, that is why most Pakistani couples are found reproducing more and more in greed of having more number of sons than daughters.

To undo this social behaviour that has been widely reinforced in our personalities since decades, there is a need to change the mindset of people. It is high time to spread awareness and make people realise that "girls are NOT a burden" and should not be treated likewise. Parents at home, and teachers in the school, should make a part of their upbringing the criteria to make both men and women learn the "rights" of women and strive to introduce the concepts of "mutual tolerance" and "mutual respect" when working together. Social environment should be favourable so that a girl can easily work on her dreams without getting threatened from any side. The practice to treat a girl as a burden should be discouraged on every platform as this kind of behaviour does not exist in developed countries, where women feel empowered and motivated to pursue their dreams and careers even after getting married. The reason why our country is lagging behind in various economic sectors is because our women are trapped inside a bubble of "social inequality" where men do not allow them to come forward and prove their worth on equal footing. This bubble should be immediately burst in order to liberate women from the prison of such patriarchal thoughts that hinder their excellence.

Being the "queen" of her house or the "angel" in the family, she is truly a great "blessing" and owes an extremely sacred position in the society. While rejecting the notion that "she is a burden", she must be given that place without her begging for it.

Why is it important to build emotional intelligence in children?

Being able to distinguish between feelings and holding only those that are important for growth could do wonders

Kanzah Mahar

I was walking a friend out the door after an intense discussion. The end of our meeting turned out to be a step by step process. First, we concluded the discussion verbally, and then briefly discussed some follow-up thoughts. Then we stood up and spoke some more. Next, there was a new topic we took up on our way to the door. Finally, we continued to speak as she waited for the elevator. All this while, my eight-year-old student was observing us.

When my friend finally left, he said, "You really wanted her to leave but she just wasn't going was she?"

At first, I was slightly defensive because obviously not wanting someone to stay is rude. Plus, she's a good friend. And then to admit to an eight-year-old, who I'm supposed to be mentoring that I wanted a guest to leave, was a bit much. Then I started to realise rather admit I was slightly agitated. It was true- I wanted our meeting to end because I had to start teaching. I was pleasantly surprised that this little guy was able to pick up on my body language and verbal cues, something my grown-up friend wasn't able to do.

"Wow M, it's amazing that you picked up on that. Good Job!" he sat there with a cheeky smile, swinging his feet back and forth.

I was quite pleased with both of us. I was proud of him for being so observant, but also a little of myself for noticing. Basically, I can tell you that working with kids teaches you a lot.

I have been working with younger children for about seven odd years. That, and the fact that I have had a fair share of psychological education, makes me curious about what is going on with them. Especially when it comes to their emotions, and how they choose to react to them.

Younger children tend to show you how to approach life in the simplest ways. Although most of the time this approach is immature, it can be quite honest and free of the unnecessary baggage adults carry. For instance, they are annoyingly aware of what they want and don't want to do, and will mostly never hesitate to make you aware of it.

However, as with everything else, children need help navigating. A lot of the time I notice them hoarding second-hand emotions like guilt, regret, or resentments. No household is bereft of difficult experiences, and many times adults seem to overlook these silent observers. In fact, adults usually underestimate how much children absorb and hone. Unfortunately, most of the time this can have devastating effects in adulthood (Hello, Freud!).

So simple questions that help them roughly identify, compartmentalise, and see where these emotions might be coming from actually helps release some of the energy almost instantly. Once a student told me how she feels "bad" because her parents had contracted an illness on a trip, while she was thousands of miles away. After a short discussion she told me that this was because she wasn't there with them. The little girl was sitting with guilt. A simple follow up conversation helped her disengage from the guilt, it was okay for her to feel down because her parents were not well, and so perhaps pray for them. But she no longer had to feel responsible for this.

It's simple statements or questions like "How does this make you feel?", "What can you do to make it better?", "This isn't your fault", or even, "It is okay to feel such and such". Once children learn to exercise such thoughts, they can become instinctive, and even evolve as they grow up. So emotional intelligence is a powerful tool, in fact, having been through the disaster that was 2020, this is truer than ever before.

Being given skills to identify our feelings and prioritise them and as a result holding what is necessary for growth and wellbeing and dismissing what is not; also then being able to pick up on what others are experiencing could do wonders. Imagine the amount of people who get intervention at the right time, the amount of conflicts and misunderstandings avoided- the possibilities are endless. I am wondering if the world would be slightly easier for everyone if people were taught from a young age to be aware of their own emotions, be aware of the emotions of others, and self-regulate. Perhaps this is part of the solution. Perhaps this is the solution.

Will smog exacerbate the impact of Covid-19 in Pakistan?

Infections and mortality rates will be different to what Pakistan experienced during the first wave

Syeda Hadika Jamshaid

Pakistan reported its first coronavirus infection on February 26, 2020, and, according to the data available at the time, it was feared that the mortality rate would be higher in provinces which have urban centres with high levels of air pollution. However, as the situation evolved, Khyber Pakhtunkhwa (K-P) reported the highest mortality rate, which was often attributed to a range of explanations, but one explanation that remained curiously absent was air pollution. This was due to the fact that in the summer season the concentration of air pollutants is comparatively low. On June 13th, Pakistan reported its highest number of Covid-19 cases, but by July the cases of local transmissions had plummeted in the country.

As a result, life returned to 'normal', and the high recovery rates across the country led people to believe that Pakistan had successfully tackled Covid-19. However, fast forward three months, Pakistan is now expecting the second wave of Covid-19 in the winter season. It is speculated now that the infections and mortality rates will be different to what Pakistan experienced during the first wave in the summer. Prime Minister Imran Khan, while addressing an award ceremony of Clean Green Pakistan Index in Islamabad, requested people "to exercise social distancing and self-discipline as a high level of pollution is contributing to the rising number of coronavirus cases".

The problem

The concentration of PM2.5 in the air at 10 µg/m3 is rendered to be safe as per the World Health Organisation (WHO) Air Quality Guidelines. However, Pakistan has an annual average of PM2.5 of 65.81µg/m3, and was hence ranked as the second most polluted country in the IQAir AirVisual 2019 World Air Quality Report. The report also highlighted that the cities with high air pollution levels observe ten times more annual hours in the highest US AQI bracket (250.4 µg/m3) than in the US AQI bracket which meets the WHO annual target (<10 µg/m3). With the approaching winter, Pakistan is destined for another smog episode linked to the high pollutant concentrations due to waste crop burning, vehicular and industrial emissions, increased fuel burning for space heating, and smoke from brick kilns and a confluence of natural temperature inversion.

The impact

The impact of air pollution on the immune system has been widely researched, and it has been proven that it not only impacts immunity of the body but it is also associated with the exacerbation of pulmonary diseases. Moreover, the presence of high PM and nitrogen dioxide in the air is also linked to an increase in the spread of the virus since they can act as vectors which increase the number of receptors by 100 folds in the lungs to which the virus binds. Therefore, citizens who have lived in cities with poor air quality often have weakened immune defences and damaged lungs; hence rendering them more susceptible to the impacts of Covid-19. The study also proves that chronic lung exposure to nitrogen dioxide acts as a potent oxidant depleting anti-oxidant stores, leading to impaired tissue defences which may also favour pulmonary damage in Covid-19 patients. This can further give rise to the number of individuals contracting the virus and inundate the already struggling healthcare system.

The solution

At an individual level, it is needed now more than ever for every citizen to take Covid-19 seriously and to follow the SOPs. As things currently stand, prevention remains the key. At the governmental level, certain initiatives have been recorded in the past two years to curb the high pollutant levels in the country, especially after the winter smog episode of 2019. The government terminated the functioning of factories in 12 highly polluted districts for two months in the winter to reduce smog levels, and influenced brick kiln owners to transition to cleaner technologies. The government also announced the Electric Vehicle Policy in December 2019 to combat the emissions from the transport sector causing air pollution and greenhouse gas emissions, and in August 2020 the import of Euro-V standard fuel started in Pakistan. With these initiatives there is a need for the implementation of a clean air programme at the federal level, with an aim to improve the technical capacity of the country to record credible air pollution data to pin-point the sources of air pollution and take action against them. The Ministry of Climate Change has been involved in the revision of the Pakistan Clean Air Programme 2020 that emphasises the enhanced roles of the provinces on environment-related issues following the 18th Amendment to the Constitution. The pandemic has further highlighted how vital it is for Pakistan to implement the clean air programme. While all these initiatives are positive steps in the right direction, their successes will be dictated by a strict implementation and adherence by the population. It becomes imperative for the citizens to play their role in ensuring that the potential exacerbation of the Covid-19 crisis due to the seasonal smog is countered by curbing activities that could facilitate the smog, while also ensuring a safety first approach by following the SOPs.

Look At The Bright Side!

By Sundas Noreen

Centuries passed and still the same, War in our blood, some things never change. Fighting for land and personal gain, better your life, justify our pain. The end is knocking."

"Lost" lyric from Avenged Sevenfold truly reflects the present state of humanity. Negative Thoughts have become our asset and it is this negativity that is swallowing up the positive aspects. Our words are actually very important not only for those who hear, but for ourselves as well. The habit of being negative influence our actions. We are actually fond of looking at the darker side, thinking of failure before trying, demotivating others, focusing on difficulties and hardships and do not thinking of something positive that might occur or will actually occur.

Success and failures are part of life, every successful person has failed somewhere, but learning from the failures is the only difference between a successful and failed person. To achieve success one must develop motivation, determination and positivity.

Positive thinking is a mental attitude that admits into the thoughts that are conductive to growth and success. It is our thinking that expects good or bad results. Whatever we think, we find it actually. Not everyone has the ability to remain positive in every situation. A positive mind gets a successful and favorable outcome of every situation.

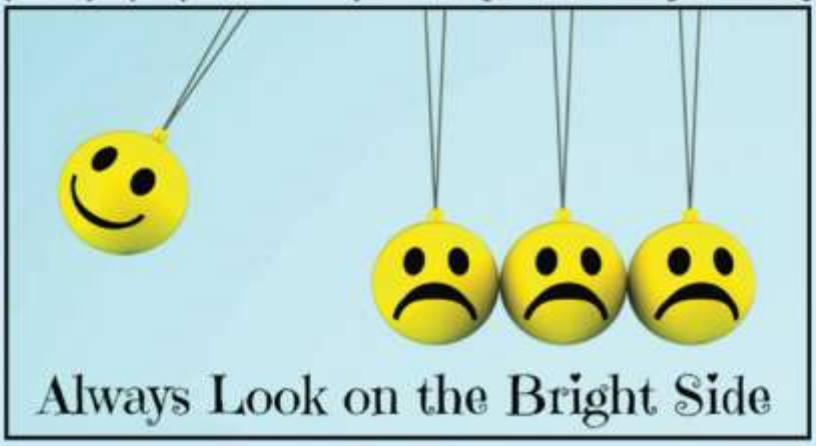

"Nothing is Impossible", this sort of thoughts needs to be developed. Every small or big, easy or complex problem have its solution, the only requirement is determination, confidence and hard work to find the solution.

Power of Positivity helps turning dreams into reality and avoiding stress and depression. Bo Bennett rightly said:

"Having a positive mental attitude is asking how something can be done rather than saying it can't be done."

The Question then is How to Stay Positive. Optimism is something to strive for, there are various ways through which one can stay determined and positive:

• Look for Something Positive in a Negative Situation

In every situation, there is something good. Most of the time it's not obvious, we have to look. And sometimes we have to look hard.

• Begin Everyday with Optimism

One must start day with positive affirmation, motivate yourself and must have good hopes for the whole day.

• Think of Failures as Lessons

No one is perfect, everyone makes mistakes and experience failure many times. A successful person is the one who learn from his mistakes and turn failure into lessons.

• Get Rid of Past and Focus on Present

One must focus on the present, the past cannot be undone. Living at the present moment is extremely important. Being in the present moment means that we are aware and mindful of what is happening at this very moment. We are not distracted by deliberations of the past.

• Have a Positive Company

One must stay in the company of Positive people. Negative attracts Negative, remaining in a positive company affects the way of thinking and one can achieve positive outlooks and affirmations.

• Learn to Take Criticism in a good way

One of the most common fears is the fear of criticism. It can hold people back from doing what they want in life. One must take criticism in a healthy way and learn from it.

HAPPINESS: DO YOU KNOW IT'S ADDRESS?

By Fatima Fazal Abbasi

Human life is full of struggles. From birth to death, we are striving hard to achieve something. Imagine a seven-year-old boy, who has an exam after two days and he is feeling so tense and burdened. Now visualize a university student who must submit his final year project after a week, he is working day and night to complete all his work. After getting education, we want to achieve a good job and again put in all our effort to get a job. Our journey of struggle does not end after achieving our dream job, rather we then start striving to get promotions and finally, when we are settled in our j ob, our next goal is to provide a luxurious life to our children, enlighten their minds with quality education and assist them to be settled in their lives. All humans, no matter which socio-economic background they belong to, are trying in their own unique way for making their lives free of pain and full of pleasure. We are made to believe that financial gains and social status is the source of our pleasure or happiness. We rely on these external things to make our life blissful but as they are not in our control, thus instead of freeing us and making us happy, this belief traps us in an endless loop to keep us chasing after a false promise while the "happiness " we're laboriously slaving for slips farther away from our grasp.

Today I will give you the right address of happiness. As we know that, in this universe, the location of everything is defined by space and time. Same is the case with happiness, it is also defined by space and time. As far a s spatial location is concerned, our happiness resides within us all. The time where happiness exists, is present.

To extract happiness from within, we have to introduce ourselves with the concept of self -love. Self-love means being satisfied with ourselves, accepting our flaws and imperfections, being kind and gentle with ourselves and forgiving ourselves for all the mistakes that we've ever made. But the question here is, why is self-care important? Imagine yourself in a situation where there seems to be no ray of hope and there is no one to listen to you or to keep you calm. Then there is only one person with you, that is your own self. If you have a positive self-image about yourself and know your self-worth, then you will have the belief that "I can overcome this situation" and you will focus on the solution. This constructive approach will bring positivity that will help you fight with the grim situation without conscious effort. On the contrary, if you have a negative self-belief, then you will underestimate yourself, blame yourself for being stuck in this problem, and your mind will be so involved in such thoughts that you will not be able to think of any solution and will depend on others to help you. Such thoughts will make you miserable. They will lead you to pain and suffering that is opposite of happiness. So, we should always be satisfied with ourselves, love and take care of ourselves and it can automatically lead us to happiness.

The other important factor that can be a source of happiness is living in the present moment. Painful memories of the past and fear of the future cause frustration which leads us toward dissatisfaction. There is a need to understand this fact that neither our worry and stress can change the past nor future-anxiety can prevent future problems rather it is just destroying our present and affecting our peace of mind. We have no control either on past or future but we have power only to control the present as it is still in our hands and we can make it memorable and wonderful. So, we should live in the present, enjoying each and every blessing that we have with gratitude and be optimistic about the future.

Thus, life is short and unpredictable and we do not know how and when it will end. We should try to make each and every moment memorable for ourselves and those around us and obviously it is not possible without being contented with ourselves and without living in the present moment. When we will be happy and joyful, this happiness and joy will emanate from us and will fill everything and everyone around us. On the contrary, if we spend our life struggling and striving and believing that our happiness depends on external things and it lies somewhere in future or in memories of the past, then we won't get anything other than dissatisfaction and disappointment. These negative emotions will not only engulf our lives but they will cast their shadows on lives of those who are connected with us.

Home Garden: The Secret To Good Health!

The home garden is also called a kitchen garden. This is the process of growing vegetables on a home scale. For centuries man has been growing vegetables in his home so that he can arrange his food. Vegetables are an important part of the human diet and the secret to good health. They can be grown in small plots or pots, cans, plastic bottles, and wooden crates. There are several health benefits to using a home garden.

Nutritional And Medical Benefits

Fortunately, four seasons are found in most parts of Pakistan and different types of production are possible in these seasons. That is, one or another vegetable can be obtained throughout the year. Vegetables are called "protective foods" because of their nutritional and medical benefits. This is because they are rich in all the essential nutrients such as starch, proteins, vitamins, and salts for maintaining health and optimal growth of the body. The benefits of vegetables are also evident in the prevention and treatment of diseases.

Vegetables help in the excretion of waste products from the body, cleanse the cholesterol layers in the intestines, and are an elixir for brain development. Their balanced use builds immunity in the body against various diseases and eliminates gastric acidity. As such, they are an integral part of the human diet.

To Improve The Overall Health

Gardening is a great hobby that affects a person's physical, spiritual, and mental health. This is an excellent physical exercise that helps you lose weight and improve your health. Being overweight in itself is a precursor to many diseases. Many home-grown vegetables meet many human nutritional needs. According to the World Health Organization, more than 50% of pregnant women in developing countries suffer from anemia due to iron deficiency, while the iron is found in abundance in vegetables. The home garden is the best solution to the problem of malnutrition.

Also, colorful vegetable plants enhance the decoration of the house, the beauty of the environment, and peace of mind. Colorful butterflies and birds flying over the plants throughout the day fill the atmosphere with their enchanting sounds.

Plants, Ongoing Charity

The Prophet (PBUH) strongly emphasized the planting of trees and forbade them to be cut down without any reason. Plants are necessary not only for our world but also for the hereafter. It is narrated on the authority of Anas ibn Malik(RA) that the Holy Prophet (PBUH) said: "If a Muslim plants a tree and its fruit is eaten by men and animals, the reward for planting it is charity" (Bukhari).

A Source Of Improvement In The Environment And Weather

Nature has created many plants that can bring various agricultural and environmental benefits and according to modern research they can be easily grown in the home garden. For example, mint, which is unique for getting rid of many types of insects. While there are many benefits to eating mint, its aroma is useful in repelling flies and mosquitoes. The mosquito will run away from the room where the Podina plant pot is kept and the person can avoid diseases like malaria and dengue. Besides, plants release oxygen into the air and play an important role in cleaning our homes from air pollution by absorbing carbon dioxide.

Rising temperatures due to lack of trees have led to droughts on the one hand and heavy rains, floods, and storms on the other. For the last several years in Pakistan, crops have been ruined due to excessive and untimely rains. Experts believe that if people grow different types of fruits and vegetables and keep chickens in their homes on high ground, at least they will not suffer from malnutrition. The present government has made various efforts to overcome the shortage of trees, including the 'Plant Ten Billion Trees' campaign.

A Way To Save And Increase Income

It is possible to save from the home garden. The bulk of our household income comes from buying kitchenware. This money will be saved when the daily vegetables are available at home. And you can save money by using vegetables in various home remedies.

The business of surplus plants and vegetables is also a source of income. These plants can be supplied to various nurseries and foundations, while fresh, chemical-free, and organic home-grown organic vegetables are now extinct and very expensive in large cities. The business of these vegetables is profitable. In the same way, we know that since ancient times, vegetables have been used in home remedies to enhance beauty. By making various beauty

At least 2000 additional deaths: The REAL face of COVID-19 in Pakistan

Aliza Ayaz

COVID-19 cases are surging across the country again. The number of critical care patients have doubled in the past two weeks and "positivity" amongst daily tested is on the rise. Joint Ministerial Meetings between the Education and Health Ministers decided the closure of all educational facilities, moving to home-based and remote learning. Yet, we hear the deaths are "only just 7744" as of 25/11/20 in total. Is this far too much or far too less - given Pakistan's size, demographic and socioeconomic dynamic - all of which are clear exacerbators of coronavirus transmission?

The apparent picture of COVID-19 numbers. Are we bending the curve in Pakistan? Here's a breakdown on why the numbers are, in fact, lower than reported.

DATA RELIABILITY

The question about the reliability of data remains in a region with relatively low levels of public health spending. Many deaths are not reported within the vital registration system. The death toll of COVID-19 is not going to be accurate until epidemiologists and statisticians on ground in Pakistan have time to crunch the numbers. But the excess stresses on our healthcare system are clearly evident in countless first-hand reports from emergency rooms and ICUs in our hardest-hit regions.

ATTITUDES AND ACCESS PERTAINING TO COVID-19 TESTING

Testing is synonymous with losing their wages while employees have no option but to isolate while waiting for their tests. A COVID-19 test takes 24-72 hours.

In Pakistan, there is a bigger issue of precarious work. If people cannot attend work, while waiting at home for test results or recovering, they may lose their job altogether.

Through no fault of their own, many people remain uneducated on the severity and transmission of COVID-19 simply because they have zero to minimum interaction with digital platforms, including television where key health and safety measures are announced. The bottom 30% of Pakistan's income class - the poor and illiterate potentially form an extra 5% of the country's COVID deaths, often ignoring COVID-19 symptoms as the seasonal flu and proceeding to funeral processes without hospital death inspections.

Furthermore, there is prevalent distrust in the public health system and worry about the extent of government hospital scrutiny a positive result will bring. These concerns cannot be dismissed as paranoid. Fears of invasive procedures are associated with past trauma, such as sexual abuse. Communities who believe to have experienced marginalisation may also be less likely to trust governments and health systems.

FALSE NEGATIVES

Various clinics across the globe have confirmed that more than 30% of RT-PCR results can be falsely negative depending on when the patient's sample was collected. When patients who have symptoms of COVID-19 but are not tested, test negative or have an inconclusive result die, their deaths are not included.

Leading the COVID-19 response across the Middle East, Senior Pulmonologist, Dr. Rana Najmi clarified, "Pakistan has a major blindspot in the form of suspected deaths because all nucleic acid-based COVID-19 tests (including CBNAAT and RT-PCR) can sometimes return false negatives. Our

counterparts at Harvard confirm that the reported rate of false negative results is as high as 50%, which is why antigen tests are not favoured as a single test for active infection. A clinical diagnosis, which a doctor makes based on a person's symptoms, along with other signs, like a telltale haze on X-rays or CT scans and low blood-oxygen levels, is a more dependable way to identify COVID-19 patients. We could be improving COVID-19 reporting Pakistan through a number of ways, which would lead to more accurate numbers for COVID-19 deaths."

OVERLAPPING CAUSES OF DEATH

"The locals keep saying older people are dying as they normally would. These are the normal amount of deaths that would be occurring regardless of corona. This is far from the truth, the burden is at least 15% higher. The percentage of elderly and young people dying in the past 6 months are both higher than from the "normal", prevalent causes of death in Pakistan." said Dr. Zamir Hidayat (name changed, Jinnah Medical Hospital Karachi).

It is possible that only a fraction of COVID-19 confirmed deaths are being recorded because of the pre-existing conditions the patient may have had, like diabetes, cancer or AIDS which exacerbate COVID-19 symptoms. These so-called "deaths due to comorbidities" are then excluded from the country's' death tolls.

For example, lungs are already compromised in those suffering from chronic obstructive pulmonary disease (COPD), asthma or those who are chain-smokers. COVID-19 may be superimposed on the underlying illness. Such an individual may be COVID-19 positive, but the primary cause may be something else, like asthma or COPD. Additionally, COVID-19 is not the cause of death when patients who are immunocompromised with diseases like HIV or tuberculosis.

Dr. Ellie Aziz, based in Lifecare Hospital in Abu Dhabi, further commented "During a pandemic, clinical diagnosis becomes all the more important, although not feasible due to capacity and social distancing reasons. The fact remains between clinical criteria and a lab test, the former is more reliable, unless both tally."

THE LACK OF BELIEF IN REINFECTION

There is a dire need to understand the virology and characteristics of SARS-COV-2 whether the antibody response is truly protective, and whether reinfection is due to fading immunity or reinfection by a mutant virus. Winter suits many respiratory viruses and may be conducive for corona. What really matters is adapting the control and preventing public health measures. Transmission is on the rise because people are interacting indoors within their confined homes to escape "smart lockdowns." There are more indoor activities with poor ventilation. Children who were attending school may be carriers to elders.

THE PAST GOING FORWARD

Dr. Muhammad Hakim (MBBS, MS Epidemiology, PhD Scholar at Department of Public Health and Social Sciences, Khyber Medical University) adds that the virus was first confirmed to have reached Pakistan on 26 February 2020, a student in Karachi who had just returned from Iran. For Pakistan it took 8 Months and 12 Days (Total 260 Days) to reach 350,000 confirmed cases of COVID-19 on 12th November 2020,Which is the 27th highest number of confirmed cases in the world.

From 1st Case to 50,000 Confirmed Cases in 86 Days.
From 50,000 Cases to 100,000 Confirmed Cases in 17 Days.
From 100,000 Cases to 150,000 Confirmed Cases in 9 Days.
From 150,000 Case to 200,000 Confirmed Cases in 11 Days.
From 200,000 Cases to 250,000 Confirmed Cases in 15 Days
From 250,000 Cases to 300,000 Confirmed Cases in 60 Days
From 300,000 Cases to 350,000 Confirmed Cases in 63 Days.
NEXT to 400,000 Confirmed Cases will be in How many Days???.

The Second Wave in Pakistan has already started.
https://en.dailypakistan.com.pk/digital_images/large/2020-11-30/at-least-2000-additional-deaths-the-real-face-of-covid-19-in-pakistan-1606742711-4159.png

If we rely on the simple ratio of cases/deaths to date (400000:7744 - figures sourced from the Pak Government's website), based on the rate of increase pictured above, the COVID-19 deaths are expected to increase by at least another 306 deaths in the next 6 months. "When taking into account underreporting and less testing - the two most significant red flags - and based on the trend, we can expect that we have potentially not accounted for up to 6k deaths." Dr. Hakim.

COVID-19 statistics are under-reported in Pakistan, not intentionally. Under-reporting occurs in every disease outbreak worldwide; however, keeping track of the COVID-19 out-break in developing countries is especially challenging. Evaluation of democracy related indicators prove that countries with lower rankings are posed with greater COVID-19 under-reporting issues.

Maintaining an accurate account of the number of national COVID-19 cases is critical for evaluating the national and global burden of the disease and managing COVID-19 prevention and control efforts. Therefore, correlated factors need to be addressed in order to reduce under-reporting. There is heavy reliance on reliable reporting: epidemiologists use it to predict a disease's trajectory, researchers use it to develop treatments and vaccines, responders utilise it to trace transmission, and the public to protect itself.

The people of Pakistan have declared a premature victory where the real battle is still to come. The symptoms of reinfection are severe in this case and other few reported cases and reinfections have implications for vaccine development and application.

What has become clear is that strong, transparent, and accountable leadership and communication strategies at all levels are crucial in COVID-19 outbreak management to ensure the successful control of epidemic and to prevent secondary problems.

Disrupting Pakistan's education system with innovation

Usman Suhail

In order for nations to progress, a high-quality educational infrastructure based on equity and equality is stressed upon worldwide, that inculcates the right habits, fosters personality growth and makes one a productive citizen of the state. Huge strides in progress made by the Europeans, especially Germany and the Nordic states are a testament to their exceptional educational system.

Pakistan is faced with a multitude of issues that are deeply rooted and strongly connected with the disparity in educational standards in the country. In fact, the lack of basic education is perhaps the bigger problem out of the two. There are multiple factors behind both the lack of education, and a low standard of education including negligence of past governments towards education, lax attitude of the parents towards getting their children educated, and an insignificant allocation of funds for education in the budget. To make matters worse, even the allocated budget is misused.

To improve this situation, the government should implement an educational emergency in collaboration with the private sector. In addition, it should focus on decreasing dropout rates in schools by using new and effective ways of teaching that attract students towards studying such as the use of IT, a uniform education system and removal of imbalance, the addition of equity and accountability, and finally removal of any financial snags that could deter students from enrolment.

Zharbiz International, an international firm, working towards promotion of education in developing countries, such as the Philippines, plans to assist the Pakistan government in its goal to promote inclusivity and a uniform education system; accessible for all. The organization is basically involved in multiple sectors such as Waste-to-Energy conversion, environment and deployment of commercial drones, besides education.

In pursuit of its ambitious goals, the organization envisions introducing a more interactive, transparent, interesting and much advanced Adaptive Education Learning System (AELS) or Zharbiz cleaned learning platform, as the company puts it; a shift from the currently deployed Learning Management System (LMS) in Pakistani educational institutes. Claned was developed by education scientists from Finland in conjunction with top university's research departments back in 2013. It's already being used in 40 countries including many in Europe, but now eyeing implementation in South-East Asia.

With the help of the platform, the teacher or professor can easily monitor every student in a classroom, getting reports on a daily, weekly basis, or as required to see the progress of students. The platform/software registers when a student signs in shows total time spent on the platform, also shows how often a book was opened during a session, and if there was any difficulty faced during studying. It's collaborative in nature, e.g. if the students have a question, he doesn't have to wait for the teacher; another student could also answer the query. Another interesting aspect is that students can measure their progress themselves for the percentage, of course, they've completed, also videos and social media links can be added to it, making it more engaging and interesting.

It is pertinent to mention here that the Zharbiz-Claned learning platform is already in use by Finnish universities, so the students using it are on a higher level of learning as compared with other children or individuals, also, the system is fun, unlike the one's currently in use, more importantly, it's a futuristic cloud-based platform, managed by MS Azure which is scalable to millions of students.

Furthermore, It motivates kids to study and become self-responsible to educate themselves, which is a big problem in Pakistan. One of the best features of the system is its suitability for schools, colleges and universities alike, as in it can be tailored to suit the needs of the client. Transfer from an LMS based platform to this platform is possible within a couple of days, while the teacher training is again relatively easy.

Moreover, one of the salient features of the platform is that parents yearning to send their kids abroad for studies won't need to do so, as the facility would be available in Pakistan. The organization also plans to set up an open university online in collaboration with top South African and UK universities.

Effect Of Covid 19 Pandemic On Economic Inequalities

Aiyza Javaid

It is indeed painful to analyze that a pandemic like COVID 19 has generally contributed to economic inequality in countries globally. In low and middle income countries especially, COVID 19 pandemic has made the poor man suffer more. It is disillusioning to see that whenever any pandemic hits a nation at large, the poor man tends to bear its burnt more.

It has been analyzed that usually the poor population globally is prone to COVID 19 pandemic. The poor population especially of Central Africa and Southeast Asian countries have a closer contact with birds and animals, which transmits viruses of diseases like COVID 19 pandemic. It is majorly because the poor nations of Central Africa and Southeast Asian countries are undergoing accelerating expansions of human settlements leading towards increasing agricultural and livestock production.

Sadly, on the outbreak of a pandemic like COVID 19,the poor man in low and middle income countries(LMIC) fail to afford the required medicines for treatment and recovery. Due to least accessibility to appropriate health facilities in an event of a serious COVID 19 virus, a large proportion of poor population dwelling in LMIC have lost their lives. This consequently has an adverse impact on economies of these countries as a family of the low and middle income strata in African and Asian countries is dependent on earnings of majorly a single individual, who when succumbed to a deadly virus like Covid 19 entails a huge economic burden for the entire family unit. The loss of life of the bread earner of the family means a sheer loss of income of the household unit depriving it from fulfillment of its basic necessities. This unfortunately grows economic discrepancy in low and middle income countries whereby the poor tends to get poorer and the rich flourishes.

In addition, COVID 19 has led to lockdowns, market closures, conscious and fearful consumers avoiding marketplaces. This hence entails a serious economic damage especially for the poor households, who already fail to make their both ends meet thereby resulting in anincreasing economic inequality. An expert analysis presents that about six to eight percent of the global population is likely to be pushed into poverty as governments close down businesses to contain the spread of corona virus.

A study presented by United Nations titled as "Estimates of the impact of COVID 19 on global poverty" states that COVID 19 is an imminent threat to the fulfilment of Sustainable Development Goals to end the poverty by 2030. It ever since 1990 could be a complete reversal to the efforts made globally for reducing the poverty.

COVID 19, overall has increased economic inequality globally by making the poor population poorer and has created a new cohort of poor. UK and USA are reported to be most adversely affected by COVID 19 in terms of economic recession and unemployment. About 20.4 million people lost their jobs in USA during the COVID crisis period.

Considering the economic inequalities arising from COVID 19 pandemic, there stands a dire need for achieving global solidarity amongst developed and developing nations for joint sharing of resources. This is required for enabling the poor population to survive the battle against corona virus by accessing best healthcare facilities.

Emotions, an enigma

Natalia Mehmood

Emotions can be defined in many different ways by people, depending on their perspective and understanding of this word. Some make a distinction between emotions and feelings saying that a feeling is the response part of the emotion and that an emotion includes the interpretation, the perception, and the response or feeling related to the experience of a particular situation. One of the definitions of 'emotion' is, a natural instinctive state of mind deriving from one's circumstances, mood, or relationships with others'. This definition reflects on how 'emotions' are clearly something that comes from within or has been embedded in us and these so-called 'emotions' surface when they are triggered by a certain situation. Emotions are feelings that when triggered, make us react depending on our state of mind at that moment. Fight or flight mode is triggered instinctively when in a situation that could prove harmful and the need to protect yourself is provoked, emotions can surface in a similar manner but the intensity of the emotion felt by the person solely depends on the circumstances. Anything can cause different emotions to surface, from pictures to words to thoughts and much more, our state of mind at that particular moment determines what kind of action or if any action at all is to be taken as the feeling could be of joy or of anguish but this just points to a huge fact, that our emotions can easily control us and determine the outcome of a situation, be it good or bad.

There are eight primary emotions: Joy, Trust, Fear, Surprise, Sadness, Disgust, Anger, Anticipation. Biologically speaking, emotions emerge from out of the brain's limbic system. If we are inhospitable surroundings accustomed to our presence, our mind will give a positive cognitive response. This cognitive feedback will help us act appropriately. This helps us to develop a strong sense of understanding and identity. If, on the other hand, our environment is unaccommodating, our limbic system will start to breakdown in a way. We'll begin to feel negative emotions towards ourselves like self-doubt, and our morale will drop. We will start questioning ourselves, in turn these thoughts may lead to violent attempts at trying to control and suppress such feelings. It is extremely unhealthy to suppress such emotions, as they usually lead to isolation and losing oneself in a torrent of emotions, the mental and physical effects of doing so are both very dangerous. BPD or Borderline Personality Disorder is also a result of the individual's emotions and the environment's reaction being out of sync with one another.

As time goes on, the difference is intensified and life becomes a burden to bear, it gets much more difficult. Suffering and hardships become a normal part of life.

In today's busy and unpredictable world there is a lot going on and we are being pulled into many different directions all at once. We have responsibilities at work and home and at times they become too much for us to handle. Our mind and body let us know as we start to feel worried, anxious, distress, and many other negative emotions that have a strong effect on us physically and mentally. These feelings mature and become worse, thus causing depression in cases and leading to bad scenarios. A lot of students and teenagers go through these types of problems because they don't know how to control these emotions. Negative emotions like these, if they stay unkempt and disarrayed, become worse and that is why they affect the younger and more inexperienced people who don't know how to handle them. Negative emotions surface when something bad happens and positive when something good. How a person interprets a situation, be it good or bad is entirely up to themselves as there is no black and white, only gray areas. Our self-reflection also matters when it comes to emotions. If we belittle ourselves this only causes us to look at ourselves in a very negative way, like a distorted image of ourselves or a reflection in rippling waters that can't be calmed. Especially nowadays in this unprecedented and daunting situation of the coronavirus, many negative emotions are being released due to isolation and fear. There is not necessarily a 'good' or 'bad' way to handle this situation, but many people are trying to ground themselves through yoga and tai chi or other spiritual activities that calm them. Emotions are almost like unpredictable 'entities' that have a mind of their own and try to influence our actions, however, it is our will whether we listen to them or not. Controlling our negative emotions and learning how to understand and deal with them can change the world for the better.

Remove hatred and make good memories

Ayesha Ilyas

Things end but memories last forever." Said Kumar Milan and no doubt this is a very meaningful quote.

Really our things can end time

can fly even people can also pass away but the only thing which always stays with us is our memories, nobody can steal them from us. Every one has some good and bad memories in their lives when we think about our good memories, we feel refreshed and tension free, it brings a smile on our face. However, when we think about our bad memories, our mood gets off and we feel depressed so we should collect as many good memories as possible, but in the Era we are living in, there are many tensions and problems in people's lives everyone have poison in their hearts against each other. So the question comes how can we collect good memories in such a situation? For that we need to fix these three things in our minds and should take special care of them in our lives. To forgive, tolerate, and never expect because if we do not expect so if someone does something for us, it is very good, but if not, we won't be disappointed.

Secondly, if we create tolerance within ourselves, there will be no arguments and even the fight will also not increase. Last but not the least, if we starts forgiving so we can overcome resentment, anger, hatred, desires for revenge, and other negative feelings. Believe me if we start following these three points so our life will become very beautiful and will be filled with good memories because lack of tolerance, expectations and it is this unforgiving habit that breeds hatred and hatred destroys our lives. It turns the good moments of our lives into bad. To be honest, there is no benefit in these hatreds because life is too short, here we do not even know what is going to happen to us in a second. Recently, on 22th May 2020 a PIA plane enroute from Lahore to Karachi crashed only 60 seconds away to reach its destination and there are many more such incidents, this is the reality of life!

"Then what is the advantage of spending life in hatred, we must really live the life." Ups and downs occurs in everyone's life but don't be afraid of them and learn from them too. Give value to each moment of life and make it memorable because the time we have today will not get tomorrow. Try to find happiness even over little things and accumulate good memories. In fact, it is not necessary that if we have a lot of money, only then we will be able to accumulate good memories because I'm sure almost we have all heard stories from our grand parents of their good memories. While, at that time there was no concept of technology, there used to be mud houses, people did not have big cars, but bicycles. Therefore, at that time there was no hatred everyone used to live together with love and that is the secret of their good memories. Well, unfortunately nowadays people are so busy in collecting money and hating each other that they have no consciousness. And, if this continues, we will have nothing to tell our children except hatred.

The fact is, without good memories our life is like a house without a mother because even if there is everyone in the house but there is no mother, then the house seems incomplete. Similarly, life is incomplete without good memories, no matter how much luxuries we have. In fact, good memories never let us get old and they even play the role of a medicine like for example if someone is ill and we remind him of his good memories, they go back to the same moment and feel better so this is the power of good memories. Truly good memories are timeless treasure. We should always stay happy because our today's little happiness become tomorrow's precious memory. To be happy we don't have to do much but just remove the hatred from our hearts, then automatically we will start to live happily and if we are happy so we can make others happy too. Then whenever we will leave this world we will be satisfied with our lives and will take good memories with us. In fact we will always stay alive as a good memory in the hearts of others. So remove hatred and make good memories!!